اگست ۱۹۹۰ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۴
قرآن کا اسلوبِ بیان (نشری تقریر)	ڈاکٹر اسرار احمد	۵
ہدایت القرآن (۴۱)	مولانا محمد تقی امینی	۹
امام احمد بن محمد خطابی (کاروانِ حدیث ۸)	عبدالرشید عراقی	۱۴
فرائضی تحریک (بلسلہ دعوت رجوع الی القرآن)	پروفیسر محمد اسلم	۱۹
منشورِ اسلام (۱۴)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۰
حکمتِ اقبال (۲۴)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۹
لغات و اعراب قرآن (۱۵)	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۵
سیرتِ عبداللہ بن مبارکؒ	نصرت علی اثیر	۵۴
تبصرۂ کتب	ادارہ	۶۲

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہدِ صدیقی رضؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانی ابولؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰ رضؓ کی طرح حضرت حسین رضؓ بھی قاتلینِ عثمان رضؓ کی سازش کا شکار ہوئے
- سیّد الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجیے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
صرف -/۱۱ روپے (سستا ایڈیشن -/۶ روپے)

قریشی بک سٹال
سے طلب کیجیے یا ہم سے
منگوائیے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرة ۲۶۹)

ماهنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ۔ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے فلسفہ

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، پروفیسر حافظ محمد فاضل، حافظ خالد محمود خضر

جلد: ۹ | اگست ۱۹۹۰ء - محرم الحرام ۱۴۱۱ھ | شمارہ: ۸

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴- فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شادی ہال، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون - /۴۰ روپے، فی شمارہ - /۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

قرآن کالج لاہور

اعلان داخلہ
برائے بی اے کلاس

موجودہ انحطاط پذیر معاشرے میں ایک مثالی درس گاہ

چند خصوصیات

- پنجاب یونیورسٹی کے نصاب کے عین مطابق طلبہ کے لیے بہتر تعلیمی سہولت فراہم کی گئی ہے۔
- قرآن حکیم کے منتخب مقامات اور عربی زبان کی اضافی تعلیم کے ذریعے "رجوع الی القرآن" کا شعور بیدار کرنے میں یہ کالج اہم کردار ادا کرتا ہے۔
- اس طرح قرآن کالج دراصل دنیوی اور دینی تعلیم کا ایک حسین سنگم ہے۔
- قرآن کالج میں تدریسی عمل پوری سنجیدگی، شائستگی اور تسلسل کے ساتھ قریباً سارا سال جاری رہتا ہے۔
- سنجیدہ اور محنتی طلبہ کے لیے قرآن کالج ہنگاموں سے پاک پُرسکون تعلیمی ماحول اور بہتر تعلیمی مواقع فراہم کرتا ہے

اعلانات

- بی اے میں داخلہ کے لیے فارم جمع کرانے کی آخری تاریخ ۱۵ اگست ۹۰ء ہے۔
- داخلہ کے لیے انٹرویو ۲۱ اگست ۹۰ء کو ہوں گے اور تعلیم کا آغاز یکم ستمبر ۹۰ء سے ہوگا۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)
- گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ حضرات کے لیے "دینی تعلیم کے ایک سالہ کورس" میں داخلہ بھی مذکورہ بالا تاریخوں کے مطابق ہوگا۔

طلبہ کا مستقبل

- مستقبل میں شریعت لاء میں ایل۔ ایل۔ بی کرنے والوں کے لیے بہت روشن مواقع موجود ہیں۔ قرآن کالج سے گریجویشن کرنے والے طلبہ کے پاس پنجاب یونیورسٹی کی ڈگری کے ساتھ قرآن اور عربی کا علم بھی ہوگا۔ اس لیے انہیں دوسروں پر واضح برتری حاصل ہوگی۔
- سنجیدہ اور محنتی طلبہ قرآن کالج کے تعلیمی ماحول سے فائدہ اٹھا کر اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکتے ہیں اور مقابلہ کے امتحانوں میں دوسروں پر برتری حاصل کر سکتے ہیں۔
- قرآن کالج کی کوشش ہے کہ وہ پاکستان سول سروس کو ایسے افسران مہیا کرے جو اپنے علم اور کردار کی بنیاد پر روشن مثالیں قائم کر سکیں۔
- قرآن کالج کی یہ بھی کوشش ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ایسے اساتذہ مہیا کرے جو تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی کردار سازی کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیں جس کی صحیح خطوط پر بجاآوری قرآنی علوم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اہم نوٹ

F.S.c کے وہ طلبہ جو میڈیکل یا انجینیرنگ میں اتنے نمبر حاصل نہیں کر سکے کہ انہیں M.B.B.S یا B.E میں داخلہ مل سکے، انہیں اور ان کے والدین کو خصوصیت سے ہماری گزارشات پر غور کر کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ آپ کے علم میں یقیناً یہ صورتِ حال بھی ہوگی کہ اب متعدد M.B.B.S اور B.E پاس طلبہ بھی CSS کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں CSP آفیسر بننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان حالات میں قرآن کالج کے تعلیمی ماحول سے فائدہ اٹھانا یقیناً ایک بہتر اور روشن مستقبل کا ضامن فیصلہ ہوگا۔

نوٹ: مزید تفصیلات اور داخلہ فارم کے لیے دس روپے ادا کر کے پراسپکٹس حاصل کریں۔

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینی تعلیم کا ایک سالہ نصاب

احباب اس امر سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ ۱۹۸۵ء کے اوائل میں قرآن اکیڈمی میں ابتدائی دینی تعلیم کا ایک دو سالہ نصاب ترتیب دیا گیا تھا۔ اس نصاب میں عربی گرامر اور تجوید کی تعلیم اور قرآن حکیم کے بعض منتخب مقامات کی تشریح کے ساتھ ساتھ فارسی زبان، فن حدیث، فقہ اور منطق کی مبادیات کی تدریس بھی شامل تھی۔ مزید برآں گرامر کے قواعد کے اجرا کے ساتھ پورے قرآن حکیم کا ترجمہ بھی شاملِ نصاب تھا۔ یہ تعلیمی اسکیم بنیادی طور پر اُن طلبہ کے لیے تشکیل دی گئی تھی جو پوسٹ گریجویشن یا گریجویشن کی تکمیل کے بعد تلاشِ معاش کی بھاگ دوڑ میں شریک ہونے سے قبل دو سال دینی تعلیم کے لیے وقف کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ جب تک دینی تعلیم کے حصول کا ایک شدید داعیہ اور تعلیم و تعلّمِ قرآن کی گہری لگن نہ ہو، زندگی کے اس اہم مرحلے پر دو سال کا یہ ایثار ہرگز آسان نہیں! چنانچہ اس کے باوجود کہ ابتدائی دو تین سالوں میں تنظیم اسلامی اور مرکزی انجمن سے وابستہ نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد نے اس کورس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور الحمد للہ اس نصاب کی بہت افادیت محسوس کی گئی، لوگوں کے دباؤ اور حالات کے تقاضے کے تحت ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس کورس کو سکیڑ کر ایک سال تک محدود کر دیا جائے۔ چنانچہ پچھلے دو سال سے 'دینی تعلیم کا ایک سالہ نصاب' کے عنوان سے یہ تعلیمی اسکیم روبعمل ہے۔ اس کے نصاب میں ہمیں جو کتر بیونت کرنی پڑی — اس کی تفصیل یہ ہے کہ عربی گرامر اور تجوید کی بنیادی تعلیم، اور قرآن حکیم کے منتخب مقامات کی تشریح کو ہم نے نصاب میں برقرار رکھا ہے۔ پورے قرآن حکیم کے ترجمے کی بجائے اب اس مختصر وقت میں عملاً زیادہ سے زیادہ پانچ پاروں کا ترجمہ ممکن ہے۔ حدیث، فقہ اور منطق کو ہمیں اپنے نصاب سے ساقط کرنا پڑا ہے تاہم مصطلحاتِ حدیث اور مطالعۂ حدیث کا ایک مختصر نصاب اس کورس میں شامل ہے۔

یہ کورس اپنی تمام تر محدودیت کے باوجود بھی دینی تعلیم کے لیے ایک اچھی اساس فراہم کر دیتا ہے اور الحمد للہ ہر سال اچھی خاصی تعداد میں نوجوان طلبہ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ——— نئے تعلیمی سال کے لیے داخلے جاری ہیں۔ ترجیحاً گریجویٹ طلبہ کو اس کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ تاہم ایف اے پاس طلبہ کے لیے گنجائش بھی رکھی گئی ہے — ان شاء اللہ نئی کلاس کی تدریس کا آغاز

(باقی صـ۱۳ پر)

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن کا اسلوبِ بیان

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری اور کامل واکمل رسُول ہیں اور ان پر نبوّت صرف ختم ہی نہیں ہوئی درجۂ اتمام کو بھی پہنچی ہے۔ اور رسالت کا سلسلہ بند ہی نہیں ہوا مرتبۂ تکمیل کو بھی پہنچا ہے۔ اسی اتمامِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ کا دورِ رسالت تاقیامِ قیامت جاری رہے گا۔ اور آپ کی بعثت کے بعد سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان آپؐ کی اُمّتِ دعوت میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کو جو معجزہ عطا ہوا یعنی قرآن مجید وہ بھی ہمیشہ قائم ودائم رہنے والا ہے۔ بخلاف بقیہ انبیاء ورُسل کے جن کے معجزات صرف اُن کی حیاتِ دُنیوی ہی تک محدود تھے۔

اس حقیقت پر پوری اُمّت کا اجماع ہے کہ اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بے شمار ہیں، تاہم آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ جسے تحدّی یعنی Challenge کے ساتھ پیش فرمایا گیا، وہ قرآنِ حکیم ہی ہے۔ البتہ یہ امر کہ قرآن کن کن پہلوؤں اور اعتبارات سے معجزہ ہے، علماء ومحققین کے مابین بحث وجستجو کا موضوع رہا ہے اور اس موضوع پر بہت سی مستقل کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور اعجازِ قرآنی کا ایک حد درجہ روشن پہلو یہ بھی ہے کہ خود اس موضوع کا احصاء واحاطہ بھی ممکن نہیں ہے ـــــ تاہم اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان بھی اس کے اعجاز کا ایک اہم مظہر ہے۔

واضح رہے کہ قرآنِ حکیم کا اسلوب عام انسانی تصنیفات وتالیفات کے اسلوب سے یکسر مختلف ہے، اور اس کی سورتیں ہرگز ابواب یا Chapters کی حیثیت نہیں رکھتیں اور جو لوگ

عام انسانی تصنیف و تالیف کے اسلوب کو مدِّنظر رکھ کر قرآن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ خود بھی سخت الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بقدرِ استعداد دوسروں کو بھی مغالطوں میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں ——!!

یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ اگرچہ قرآن نوعِ انسانی کے نام اللہ کا ابدی اور سرمدی پیغام ہے، تاہم اس نے فطری و منطقی طور پر اس اسلوب کا لبادہ اوڑھا ہے جو زمانہ و علاقۂ نزول کے ظروف و احوال سے مناسبت رکھتا تھا۔ عرب میں نزولِ قرآن کے زمانے میں کلام کے تین معروف اسلوب پائے جاتے تھے۔ ایک[1] شعر و قصیدہ، دوسرے[2] خطبہ و خطاب اور تیسرے[3] کاہنوں وغیرہ کا اندازِ کلام —— اور ان تینوں ہی اصناف میں کوشش ہوتی تھی کہ کلام مسجّع بھی ہو اور مُقفّٰی بھی —— یعنی الفاظ میں شان و شوکت اور شکوہ و تمکنت بھی موجود ہو اور ایک صوتی آہنگ بھی پایا جائے۔ ان میں سے شعر و قصیدہ میں وزن، بحر اور ردیف کی پابندیوں کے باعث تکلّف کا پایا جانا لازمی ہے۔ پھر یہی تکلّف تصنّع کو جنم دیتا ہے، اور بالآخر یہ تصنّع شعر و شاعری اور اس بازار کے تمام دکانداروں اور گاہکوں یعنی شاعروں اور اُن کے ہم نشینوں، مدّاحوں اور پیروؤں سب کی سیرتوں اور شخصیّتوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ چنانچہ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآن حکیم نے سورۃ الشعراء میں حد درجہ فصاحت و بلاغت اور اختصار و جامعیّت کے ساتھ اِن الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝

"یعنی شاعروں کا اتباع تو گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں، اور کہتے ہیں وہ جو کرتے نہیں!"

اور اس ضمن میں اگرچہ قرآن نے ایمان اور عملِ صالح کے حامل شعراء کو مستثنیٰ کیا ہے، تاہم استثناء تو استثناء ہی ہوتا ہے۔ اس سے قاعدہ کُلّیہ باطل نہیں ہوتا، وہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے —— یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ یٰسین میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (ہم نے انہیں شعر کہنا نہیں سکھایا، اس لیے کہ وہ ہرگز ان کے شایانِ شان نہیں ہے!) —— رہا کاہنوں کا کلام تو وہ اُن سے بھی چار قدم آگے ہے

اس لیے کہ اس میں بھی نہ صرف یہ کہ تکلّف و تصنّع درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہوتا تھا، بلکہ مزید برآں بات واضح یعنی "مُبین" نہیں بلکہ گول مول، اور ذو المعنیین ہی نہیں ذو المعانی ہوتی تھی یعنی بہت سے مختلف ہی نہیں متضاد احتمالات کی حامل ——— ان دونوں اسالیب کو ترک کر کے قرآن نے مروّجہ اسالیب میں سے خطبہ کے اسلوب کو اختیار کیا، جس میں خطیب اپنے مخاطبین کو کسی خاص بات پر آمادہ کرنا اور کسی خاص رُخ پر لے چلنا چاہتا ہے ——— گویا اُس کے کلام میں ایک مقصدِ معیّن موجود ہوتا ہے اور اگرچہ اس میں وہ الفاظ کے حسن اور شان و شوکت کو بھی ملحوظ رکھتا ہے اور صوتی آہنگ کو بھی، لیکن بس اس حد تک کہ نہ تو مفہوم و معنی میں ابہام و کنجلک پن پیدا ہو اور نہ ہی تکلّف و تصنّع کی جھلک نظر آئے۔ اور کلام کی لذّت و حلاوت کو سامع اپنے قلب کی گہرائیوں میں تو ضرور محسوس کرے لیکن اس میں انہماک اتنا نہ ہو کہ کلام کے مقصد ہی سے غفلت ہو جائے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ صفات ہیں جو تمام کی تمام بتمام و کمال قرآن کے اسلوبِ بیان میں موجود ہیں۔

پھر چونکہ اس کلام کا متکلّم خالقِ ارض و سماوات بھی ہے اور فاطرِ فطرت بھی، لہٰذا اس کے کلام میں جہاں "کَلَامُ الْمُلُوْکِ مُلُوْکُ الْکَلَامِ" کے مصداق شاہانہ اندازِ تخاطب موجود ہے وہاں فطرتِ انسانی کی گہرائیوں میں اُتر جانے کی صلاحیّت بتمام و کمال موجود ہے۔ اور ایک سلیم الفطرت انسان تو اس کو پڑھتے ہوئے ایسے محسوس کرتا ہے کہ جیسے یہ اس کی اپنی فطرت کی ترجمانی اور اس کے اپنے دل کی آواز ہو، بقول شاعر ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا ۔۔۔ مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

اسی حقیقت کو امام ابن قیّم رحمہ اللہ نے اس طرح بیان کیا کہ: "قرآن کے بعض پڑھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسے پڑھتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مصحف میں سے نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ اپنے لوحِ قلب پر کندہ تحریر پڑھ رہے ہیں"۔ قرآن کی تاثیر کا یہ وہ پہلو ہے جو انسانی اسالیبِ بیان سے بالکل ماوراء ہے اور جسے کسی انسانی حساب کتاب کے دائرے میں معیّن نہیں کیا جا سکتا۔

اس صحبت میں جو چند باتیں عرض کرنے کی کوشش کی گئی ہے انہیں قرآن مجید نے حدِ درجہ ایجاز و اعجاز کے ساتھ سورۃ الحاقّہ کی ان آیات میں بیان فرمایا:

فَلَآ أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝

تو قسم ہے مجھے ان سب اشیاء کی بھی جنہیں تم دیکھتے ہو اور اُن جملہ حقائق کی بھی جو تمہاری آنکھوں سے پنہاں ہیں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝

یقیناً یہ قرآن سنایا ہوا ہے ایک رسولِ کریم کا!

یعنی کلام تو ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کا لیکن اسے سنایا ہے ایک رسول کریم نے جس کا مصداقِ اوّل ہیں حضرت جبریل علیہ السّلام اور مصداقِ ثانی ہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝

اور نہیں ہے یہ کسی شاعر کا کلام، لیکن کم ہی ہو تم ماننے والے!

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

اور نہ ہی ہے یہ کسی کاہن کا کلام، لیکن کم ہی ہو تم یاد دہانی اور نصیحت اخذ کرنے والے!

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

بلکہ یہ تو اُتارا ہوا ہے اُس کا جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے!

اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی بات تھی جو ولید بن مغیرہ نے کہی تھی کہ لوگو! میں نے بہت سے شاعروں کی صحبت اٹھائی ہے اور میں اُن کے کلام کو پرکھ سکتا ہوں لیکن محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو پیش کر رہے ہیں وہ شاعری ہرگز نہیں۔ اسی طرح میں نے سب کاہنوں کا کلام بھی سنا ہے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیش کردہ قرآن ہرگز اُن کے کلام سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔ گویا یہ حقیقت اس پر پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ قرآنِ حکیم کسی انسان کا کلام نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بدبخت اپنی سرداری اور سرمایہ داری کے تحفّظ کے پیشِ نظر کفر پر اَڑا رہا اور ہدایت سے محروم رہ گیا۔

اعاذنا اللہ من ذٰلک ط

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

یتیموں کے لیے بہتر سے بہتر انتظام کا حکم

یتیموں کے بارے میں اللہ کی ہدایت کا احساس حد درجہ نازک رہا ہے۔ ان کی پرورش، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کے ساتھ محبت و شفقت کے برتاؤ کی ہمیشہ تاکید کی گئی ہے۔ جہاد کے حکم کے بعد یتیموں کا مسئلہ خاص طور سے سامنے آیا اور یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کا انتظام کس طرح کیا جائے — اپنے ساتھ ان کو شامل کر لیا جائے یا علیحدہ سے ان کا انتظام ہو؟ جواب دیا گیا کہ جس میں ان کا فائدہ اور ان کی بہتری ہو بس وہی انتظام ان کا کیا جائے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ
عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اصلاح و درستگی ان کے لیے بہتر ہے[1]۔ اور اگر انہیں اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ اور اللہ اصلاح کرنے والوں اور خرابی کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا[2]۔ بیشک اللہ غلبہ والا، حکمت والا ہے۔

---

[1] انتظام کی کوئی خاص صورت متعین نہیں ہے، ساری ذمہ داری انتظام کرنے والوں پر ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ کس انتظام میں کس کے پیشِ نظر اصلاح و درستگی ہے اور کس کے پیشِ نظر فساد و خرابی ہے!

ےؔ انتظام کی اگر کوئی خاص صورت متعین کردی جاتی تو اس پر عمل کرنے میں دشواری ہوسکتی تھی۔ اب خود منتظم کے مناسب سمجھنے پر ہے کہ جس صورت کو وہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔

مشرکین سے شادی بیاہ کی ممانعت

شادی بیاہ کے اثرات بہت دُور تک جاتے ہیں۔ پوری نسل تباہ ہوجاتی ہے یا سنبھل جاتی ہے۔ لوگ دوسری تمام چیزوں کی بڑی تحقیق کرتے ہیں، لیکن عقیدہ و مذہب کی ان کو پرواہ نہیں ہوتی ہے۔ آیت میں عقیدہ و مذہب کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے بلکہ اسی کو مدار اور فیصلہ کن قرار دیا گیا ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۚ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور مسلمان باندی بہتر ہے مشرک بی بی سے اگرچہ وہ تمہیں زیادہ پسند ہو۔ اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور غلام مسلمان بہتر ہے مشرک مرد سے اگرچہ وہ تمہیں زیادہ پسند ہو[1] یہ لوگ تمہیں دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور اللہ اپنے فضل سے تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے[2] اور اللہ لوگوں کے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ نصیحت حاصل کریں۔

لہ اللہ کی ہدایت نے شادی کے مسئلہ کو جتنا آسان کیا تھا بدقسمتی سے اتنا ہی زیادہ مشکل

بنا دیا گیا ہے۔ جہیز اور دوسرے رسم و رواج کی جس قدر لعنتیں مشرک قوموں میں تھیں، وہ سب مسلم قوم میں آگئی ہیں۔ ذات برادری کو تو مذہبی سند ملی ہوئی ہے۔ مذہبی نمائندے خود اس کی پشت پناہی کرتے ہیں (جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی کی بے شمار لڑکیاں زندہ درگور بنی ہوئی ہیں) عرب کی سوسائٹی میں باندی و غلام کی حیثیت اتنی بھی نہ تھی جتنی حیثیت چھوٹی سے چھوٹی برادری کے ایک فرد کی ہوتی ہے۔ پھر بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ ایماندار ہیں تو اونچی سے اونچی ذات و برادری رکھنے والے شرک سے بہتر ہیں۔ اس سے ایمان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے جو آج کی مسلم سوسائٹی میں گم ہو چکی ہے۔

۲؎ یہ ممانعت کی وجہ بیان کی ہے کہ مشرک تمہیں اس عقیدہ و مذہب کی طرف بلاتے ہیں، جو دوزخ کی طرف لے جانے والے ہیں۔ ان سے شادی بیاہ کا رشتہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ ان کے ساتھ رشتہ کرنے سے ان کا عقیدہ و مذہب تمہارے گھر میں داخل ہوگا، پھر پوری نسل اور پورے ماحول کو متاثر کرے گا۔

شادی بیاہ سے متعلق چند احکام

اللہ کی ہدایت میں شادی بیاہ کی حیثیت رسم کی نہیں ہے، بلکہ عبادت کی ہے۔ "مجھے منظور ہے" یا "میں نے قبول کیا" یہ صرف دو بول نہیں ہیں، ان کی حیثیت ایک دوسرے کی زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لیے عہد و پیمان کی ہے، جس میں اللہ کو، پورے مجمع کو اور خاص طور سے دو انسانوں کو گواہ بنایا جاتا ہے۔

یہ عہد و پیمان ایک دو دن یا چند دن کے لیے نہیں ہوتا ہے بلکہ پوری زندگی کے لیے ہوتا ہے اور قدم قدم پر اس پر عمل درآمد کی تاکید ہوتی ہے۔ اوپر کی آیت میں نکاح کا ذکر تھا، اب اس کی مناسبت سے اس سے متعلق چند احکام ذکر کیے جاتے ہیں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ
الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ
حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا
حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ
مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ
اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ
بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ
يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ
فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ
فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

اور لوگ آپ سے "ماہواری" کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے وہ "گندگی" ہے، چنانچہ تم ماہواری کے دنوں میں عورتوں سے علیحدہ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں تم ان کے پاس نہ جاؤ۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جہاں سے اللہ نے حکم دیا ہے تم ان کے پاس جاؤ۔ بیشک اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور بہت پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، تم اپنی کھیتیوں میں جیسے چاہو آؤ اور اپنے لیے آئندہ کی بھی تیاری کرو[۱] اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم ضرور اس سے ملو گے۔ اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔ اور نیکی کرنے اور پرہیزگاری اختیار کرنے اور لوگوں کی اصلاح کرنے کے خلاف اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ اور اللہ سننے والا ہے، جاننے والا ہے[۲] اللہ تمہاری لغو قسموں پر کوئی پکڑ نہیں کرتا البتہ ان قسموں پر پکڑ کرتا ہے جن کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا بردبار ہے[۳] جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے سے قسم کھا لیتے ہیں، ان کے لیے چار مہینہ کی مہلت ہے۔ پھر اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بڑا بخشنے والا رحم والا ہے۔

اور اگر انہوں نے طلاق کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو بیشک اللہ سُننے والا جاننے والا ہے[۵]

---

[۱] شوہر و بیوی کے درمیان تعلقات کی ادائیگی صرف نفس و خواہش کی تسکین کے لیے نہ ہو، بلکہ کھیتی سے پیداوار (اولاد) کی بھی نیت ہو۔ نفس و خواہش کی تسکین وقتی ہوتی ہے اور اولاد میں آئندہ کی تیاری ہے۔

[۲] گھر اور باہر انسان کو بڑی ناگواریاں پیش آتی ہیں، بڑی اذیتیں پہونچتی ہیں۔ خیر و بھلائی کا صلہ عموماً بُرائی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان تنگ آکر قسم کھا بیٹھتا ہے کہ اب خیر و بھلائی کی راہ اختیار نہ کرے گا، جیسے دنیا والے چلتے ہیں ویسے ہی چلے گا۔ آیت میں اسی کی ممانعت ہے۔ قسم کھانے کے بعد کوئی موقع آتا ہے تو بڑی آسانی سے کہہ دیتا ہے کہ میں نے اللہ کی قسم کھائی ہے کہ اب ایسا نہ کروں گا۔ یہ اللہ کی آڑ میں اس کو نشانہ بنا کر خیر و بھلائی سے رُکنا ہوا جس نے آخر دم تک خیر و بھلائی کا حکم دیا ہے۔ اسی کو خیر و بھلائی کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔

[۳] لغو و بیہودہ قسم یہ ہے کہ قصد و ارادہ کے بغیر قسم کے الفاظ زبان سے نکل گئے۔ اس پر کوئی پکڑ نہیں ہے۔ پکڑ اس پر ہے جو انسان قصد و ارادہ سے قسم کھائے۔

[۴] قسم بیوی کے پاس نہ جانے کی بھی ہوتی ہے جس کو "ایلاء" کہتے ہیں۔ اگر کسی نے ایسی قسم کھائی ہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤں گا تو اس کو چار مہینے کی مہلت ہے۔ اس مدت میں وہ بیوی کے پاس چلا جائے اور قسم کا کفارہ دے دے، بات ختم ہو گئی۔ اور اگر چار مہینے تک بیوی کے پاس نہیں گیا تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے طلاق کا ارادہ کر لیا ہے۔ چنانچہ چار مہینہ گذرنے کے بعد طلاق ہو جائے گی۔ اگر دوبارہ رکھنا چاہے تو دوسرے نکاح کی ضرورت ہو گی۔

بقیہ : حرفِ اوّل

چونکہ یکم ستمبر سے ہو جائے گا لہٰذا داخلے کے خواہشمند حضرات ۲۰ اگست تک لازماً درخواست داخلہ جمع کرا دیں!

عبد الرشید عراقی (۸)

امام احمد بن محمد خطابیؒ

بسلسلۂ محدثین کرام کی علمی خدمات

امام ابوسلیمان حمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب ۳۱۹ھ میں کابل میں پیدا ہوئے[۱] آپ کے اساتذہ و تلامذہ کی فہرست طویل ہے[۲] تحصیل حدیث کے لیے آپ نے عراق، حجاز، خراسان، اور ماوراء النہر کا سفر کیا۔ اور ہر جگہ اساطینِ فن سے استفادہ کیا۔ نیشاپور میں آپ کا قیام بہت عرصہ تک رہا۔ اور نیشاپور میں آپ نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا[۳]

امام خطابیؒ کے علمی تبحر، حفظ و ضبط، عدل و اتقان اور فہم و درایت کا علمائے فن نے اعتراف کیا ہے۔ علامہ ابن سبکیؒ (م ۷۷۱ھ) نے ان کو امام حدیث لکھا ہے[۴] حدیث کے علاوہ امام خطابی فقہ، اصولِ فقہ، لغت و عربیت، نحو و ادب اور معانی و بیان میں بھی صاحب کمال تھے[۵] امام خطابی گو خود اجتہادی بصیرت اور فقہی ژرف نگاہی میں ممتاز تھے، تاہم وہ امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کے مسلک پر کاربند تھے[۶]

امام خطابیؒ نے ۱۹ ربیع الآخر ۳۸۸ھ کو انتقال کیا[۷]

اعلام السنن

اس کا نام اعلام الحدیث اور شرح بخاری بھی ہے۔ اس میں الجامع الصحیح البخاری کی حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے اعلام السنن لطیف نکات اور مفید مطالب پر مشتمل ہے[۸] مولانا عبد السلام مبارکپوری (م ۱۳۴۲ھ) لکھتے ہیں:

"یہ ایک نہایت پاکیزہ شرح ہے۔ ابتداء کا لفظ "الحمد للہ المنعم ہے[۹]"

معالم السنن معالم السنن امام ابوداؤد سجستانیؒ (م ۲۷۵ھ) کی سنن ابی داؤد کی شرح ہے۔ اس میں امام خطابی نے حدیثوں کی شرح، اس کے اہم مطالب کی توضیح اور اس کی مشکلات کو عالمانہ انداز میں حل کیا ہے۔ اس میں احادیث کی تشریح و تفسیر اور بحث و تحقیق کا معیار بہت بلند اور طرزِ استدلال بہت دلکش ہے۔ اور امام خطابی نے حدیثوں کے اسرار و حکم پر خاص توجہ دی ہے اور اس کے ساتھ اصولِ حدیث اور فنی مباحث پر بھی عالمانہ گفتگو کی ہے۔ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد بن ابراہیم مقدسی (م ۶۶۵ھ) نے 'عجالۃ العالم من کتاب المعالم' کے نام سے اس کی تلخیص کی ہے[۱۰]

امام ابوعبداللہ حاکمؒ (م ۴۰۵ھ)

امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ المعروف حاکم ۳۲۱ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے[۱۱] آپ کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا۔ آپ کے والد عبداللہ بن محمد صاحبِ علم تھے۔ اور انہوں نے امام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ) کو دیکھا تھا[۱۲] امام حاکم کے اساتذہ اور تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ علامہ ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) نے 'تذکرۃ الحفاظ' میں اور علامہ ابن سبکی (م ۷۷۱ھ) نے 'الطبقات الشافعیہ' میں آپ کے اساتذہ اور تلامذہ کی فہرست درج کی ہے[۱۳]

امام حاکم نے سب سے پہلے نیشاپور کے علمائے کرام سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں تحصیل تعلیم کے لیے عراق، بغداد، مکہ، کوفہ، مرو، بخارا، ماوراء النہر، ہمدان اور اصفہان کا سفر کیا اور ہر جگہ کے اساطینِ فن سے اکتسابِ فیض کیا۔ مؤرخین نے آپ کو 'طواف الآفاق ورحل الکثیر' لکھا ہے[۱۴]

امام حاکم علمِ حدیث میں خاص امتیاز کی وجہ سے الحافظ الکبیر کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ حدیث میں خاص امتیاز کی وجہ سے ان کے حفظ و ضبط

اور ثقاہت و عدالت پر تمام آئمہ فن اور محدثینِ کرام کا اتفاق ہے۔ زہد، اتقاء، دیانت و امانت میں بھی ممتاز تھے۔ حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے ان کو صاحبِ حزم و ورع اور متدین و امین لکھا ہے[۱۵] علامہ ابن سبکی (م ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

"امام حاکم کی عظمتِ شان، جلالتِ قدر اور امامتِ فن پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ ان ائمہ اعلام میں سے تھے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دینِ مبین کی حفاظت کا کام لیا ہے[۱۶]

امام ابو عبداللہ حاکم نے ۳ صفر ۴۰۵ھ کو نیشاپور میں انتقال کیا[۱۷]

معرفۃ علوم الحدیث

یہ علوم حدیث پر ایک اہم اور مفید کتاب ہے۔ علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

" علوم حدیث میں لوگوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اس فن کے یگانۂ روزگار ائمہ علمائے فحول میں ابو عبداللہ حاکم ہیں۔ ان کی کتابیں مشہور ہیں۔ انہوں نے اس فن کو باقاعدہ مرتب و مہذب کیا۔ اور اس کے محاسن اچھی طرح منقح اور نمایاں کیے[۱۸]

معرفۃ علوم الحدیث ۱۹۳۵ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔

المستدرک علی الصحیحین

یہ امام ابو عبداللہ حاکم کی سب سے شہرہ آفاق اور مشہور کتاب ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں مستدرک وہ کتابیں کہلاتی ہیں جن میں ان حدیثوں کو نقل کیا جاتا ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہوں[۱۹]

مستدرک کا شمار حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ اور بعض حیثیتوں سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) نے طبقاتِ کتبِ حدیث میں اس کو تیسرے طبقہ میں شامل کیا ہے[۲۰] حافظ ابن صلاح (م ۶۴۳ھ) نے صحاح کے بعد جن کتابوں کو اہم اور قابلِ اعتماد قرار دیا ہے[۲۱] ان میں

مستدرک حاکم کا نام بھی شامل ہے[۱]

امام حاکم نے مستدرک کی ترتیب میں ابواب کی تبویب اور احادیث کے نقل و انتخاب میں حسن و موزونیت کے علاوہ جدّت و اختراع سے بھی کام لیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ امام صاحب نے صحابہ کرامؓ کے فضائل و مناقب میں صحابہ کرامؓ کے حالات بھی قلمبند کیے ہیں اور اس کے علاوہ امام حاکم نے بعض حدیثوں کے مراجع و مصادر کی بھی نشان دہی کی ہے اور اس سلسلہ میں جامع صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، مؤطا امام مالک، المبسوط امام شافعی اور صحیح ابن خزیمہ کے نام لیے ہیں۔

مستدرک حاکم ۴ جلدوں میں حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔

پہلی جلد ۱۳۳۴ھ، دوسری جلد ۱۳۴۰ھ، تیسری جلد ۱۳۴۱ھ اور چوتھی جلد ۱۳۴۲ھ میں شائع ہوئی[۲] مستدرک کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالجلال ندوی نے اس پر ایک مفید علمی و تحقیقی مقدمہ لکھا تھا۔ جو معارفؔ اعظم گڑھ جولائی، اگست ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مقدمہ کے جواب میں مولانا محمد ہاشم ندوی نے بھی ایک فاضلانہ علمی مضمون لکھا تھا جو معارفؔ اعظم گڑھ نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔

---

۱ ابن خلکان، وفیات الاعیان۔ ج ۱، ص ۳۹۷

۲ تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ: ج ۳، ص ۲۱۸

۳ سمعانی، کتاب الانساب۔ ورق ۳۰۳

ذہبی، تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۳، ص ۲۲۴

۴ ابن سبکی، طبقات الشافعیہ۔ ج ۲، ص ۲۱۸

۵ ابن جوزی، المنتظم۔ ج ۷، ص ۳۹۷

۶ ابن سبکی، طبقات الشافعیہ۔ ج ۲، ص ۱۱۸

۷ سمعانی، کتاب الانساب۔ ورق ۳۰۳

۸ ضیاء الدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین۔ ج ۲، ص ۱۲۳

۹۔ عبدالسلام مبارک پوری، سیرت البخاری۔ ص ۲۱۶

۱۰۔ حاجی خلیفہ بن مصطفےٰ، کشف الظنون ۔ ج ۱، ص ۴۲۷

۱۱۔ ابن سبکی، الطبقات الشافعیہ۔ ج ۳، ص ۶۴

۱۲۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۳، ص ۲۴۶

۱۳۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۳، ص ۲۴۲

ابن سبکی، الطبقات الشافعیہ۔ ج ۳، ص ۶۵

۱۴۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد۔ ج ۵ ص ۴۷۳

۱۵۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۱، ص ۳۵۵

۱۶۔ ابن سبکی، الطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۵

۱۷۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان۔ ج ۲، ص ۳۸۵

۱۸۔ ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۴۸۵

۱۹۔ عبدالرحمٰن مبارک پوری، مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ ص ۳۷، ۱۰۳

۲۰۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی، عجالۂ نافعہ، ص ۶

۲۱۔ ابن صلاح، مقدمہ ابن صلاح، ص ۱۹۳

۲۲۔ ضیاء الدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین۔ ج ۲، ص ۱۵۷

معزز قارئین کرام!

اپنے زرتعاون کی میعاد جو کہ آپ کے نام / پتہ کے لیبل پر درج ہے، ختم یا غلط درج ہونے پر براہِ کرم ہمیں جلد از جلد مطلع فرمادیں کہ آپ کے نام پرچہ بدستور جاری رکھا جائے؟ اس سے ہمیں یہ بھی اطمینان رہے گا کہ پرچہ آپ تک پہنچ رہا ہے اور آپ کا پتہ تبدیل نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ زرتعاون بذریعہ وی۔پی۔ ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے بروقت تحریر فرمائیں!

شکریہ آپ کے تعاون کے متمنی

مینیجر سرکولیشن

فرائضی تحریک

پروفیسر محمد اسلم

(صدر شعبۂ تاریخ، جامعہ پنجاب، لاہور)

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۱۹۹۰ء میں پڑھا گیا

برِّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب بھی یہاں حالات نامساعد ہوئے اور فکری اضمحلال اور ذہنی انتشار ملّی طاقت اور اسلامی اقدار کو مفلوج کرنے لگا اور غیر مسلم قوتیں اور بے دین عناصر اسلامی معاشرے کو نقصان پہنچانے لگے تو ملّتِ اسلامیہ کا درد دل میں رکھنے والے رہنماؤں نے ہمیشہ مہبطِ وحی 'مکہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ سے ہی فکر و عمل کی روح اور توانائی حاصل کی۔

امیر تیمور کے حملے سے سلطانِ دہلی کے وقار کو سخت دھچکا لگا اور برِعظیم پاک و ہند میں مسلم معاشرے کی چولیں ڈھیلی ہوگئیں۔ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں تو راجستھان میں ہندو راجپوتوں نے آزاد ریاستیں قائم کرلیں اور دکن میں ہندوؤں نے وجیانگر کے نام سے ایک طاقتور ریاست قائم کرلی جس نے دو صدیوں تک جنوبی ہند میں مسلمانوں کی پیش قدمی اور اسلام کی اشاعت کو روکے رکھا۔ وجیانگر کے ہندو حکمرانوں نے اپنی ریاست میں ہندو دھرم کو سنبھالا دیا اور مسلمانوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ ان کی اکثریت ترکِ وطن کر کے جزائر شرق الہند یعنی موجودہ انڈونیشیا کی جانب چلی گئی۔ راجستھان اور وجیانگر میں ہندوؤں کو سنبھالا ملا تو انہوں نے ہندو دھرم کے احیاء کی کوششوں کو تیز تر کر دیا جس کے نتیجے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو زبردستی شُدھ کرنا شروع کر دیا۔ لودھیوں کے عہد میں بہار میں ہندوؤں نے شدھی کی تحریک تیز تر

کر دی اور اسلام پر قائم رہنے والے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیا۔ کالپی کا ضابطہ دار نصیر خان شدھ ہو کر مسلمانوں پر ظلم کرنے لگا۔ دوسری جانب راجستھان میں رانا سانگا نے دوسرے راجپوت حکمرانوں پر بالا دستی قائم کر کے مسلمانوں کو برعظیم سے نکال کر یہاں رام راج قائم کرنے کے ارادے سے لاکھوں ہزار شہسوار جمع کر لئے اور راجستھان کے قدیم اسلامی اور روحانی مراکز ناگور اور اجمیر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

اسی اثنا میں بابر برِعظیم کے سیاسی افق پر نمودار ہوا اور اس نے لودھی خاندان کے آخری حکمران سلطان ابراہیم کو پانی پت کے تاریخی میدان میں شکست دے کر یہاں مغلیہ حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ رانا سانگا کا یہ خیال تھا کہ بابر بھی اپنے جدِّ امجد امیر تیمور کی طرح لوٹ مار کر کے وسطِ ایشیا کی جانب لوٹ جائے گا اور اس کے یہاں سے جاتے ہی وہ برِّعظیم میں رام راج قائم کر لے گا لیکن جب بابر نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تو رانا سانگا کو اپنے عزائم خاک میں ملتے نظر آنے لگے اور وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت بابر کو برعظیم سے نکالنے کا عزم لے کر آگرے کی جانب بڑھا۔ بابر نے فتح پور سیکری کے میدان میں رانا سانگا کا مقابلہ کیا۔ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وہ بابر جس کی پوری زندگی میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزری تھی، رانا سانگا کے لاؤ لشکر اور جنگی تیاریوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس موقعہ پر اس کی نظریں آسمان کی جانب اٹھیں۔ اس نے ناؤ نوش سے توبہ کی اور سربسجود ہو کر بارگاہِ الٰہی میں اپنی کامیابی کے لئے دعا کی اور رانا سانگا کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ بابر نے ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا کو فتح پور سیکری کے میدان میں فیصلہ کن شکست دے کر برعظیم پاک و ہند میں اسلامی قدروں کو بچالیا۔ رانا سانگا کو شکست دینا ابراہیم لودھی کے بس کی بات نہ تھی، اس کا کریڈٹ بابر کو جاتا ہے کہ اس نے رانا سانگا کو شکست دے کر مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی سے بچالیا۔

گجرات و کاٹھیاواڑ کے ساحلی علاقے مرکزِ خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے گمراہ اور ملحد فرقوں کے لئے جائے پناہ کا کام دیتے تھے۔ اس علاقے میں اسماعیلی، داؤدی بوہری، مہدوی اور اشراقی سرگرم عمل رہتے تھے۔ ان کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے شیخ علی متقی، عبدالوہاب متقی اور شیخ محمد بن طاہر بوہرہ پٹنی نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مؤخر الذکر بزرگ نے تو اپنے سر پر دستار باندھنا چھوڑ دی تھی اور یہ عہد کیا تھا کہ جب تک گجرات

میں کتاب و سنّت کا بول بالا نہ ہوگا' وہ ننگے سر رہا کریں گے - ان تینوں بزرگوں کو بدعت کا قلع قمع کرنے کا جذبہ ابنِ ہجر مکی سے ملا تھا جو شیخ علی متقی کے استاد تھے - بالفاظِ دگر ان بزرگوں کی زندگیوں میں مقصدیت کا شعلہ اُسی وقت بھڑکا جب انہوں نے حجازِ مقدس جا کر اپنی صلاحیتوں کو صیقل کیا -

اکبر' بلکہ بقول اورنگ زیب عالمگیر' اکفر کے عہد میں جب اسلام اور مسلمانوں پر افتاد پڑی اور بقول حضرت مجدّد الفؒ ثانی کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو مسلمانوں پر نہ ٹوٹی ' بنگال کا ہندو رہنما جیتنیہ مسلمانوں کو ہندو دھرم میں شامل کرنے کا عزم لے کر ندیا سے متھرا کی جانب روانہ ہوا اور اثنائے سفر مسلمانوں کو مرتد کرتا گیا - اس کے سوانح حیات میں منقول ہے کہ اس نے بجلی خان نامی ایک پٹھان کو اس کے دس ساتھیوں سمیت گئو موتر پلا کر شدھ کر لیا اور انہیں بیراگی بنا کر ہندو دھرم کی رکھشا کے لئے چھوڑ دیا - یہ پٹھان بیراگی جس تیرتھ پر جاتے تھے وہاں انہیں ہندو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے -

ان حالات میں شیخ عبد الحق محدّث دہلویؒ' جو حجازِ مقدس میں شیخ عبد الوہابؒ متقی سے حدیث کی سند لے کر اور مدینہ منورہ سے جذب القلوب کی روح لے کر برِّ عظیم آئے تھے' میدان میں نکلے - انہوں نے "مدارج النبوّۃ" لکھ کر مقامِ نبوت کو واضح کیا اور اکبر کی اجتہادی پوزیشن پر ضربِ کاری لگائی - شیخ عبد الحق محدّث بھی اپنی صلاحیت کو حجازِ مقدس میں ہی صیقل کر کے یہاں آئے تھے -

اکبر اور جہانگیر کے عہد کے عظیم مصلح حضرت مجدد الفؒ ثانی حجازِ مقدس تو نہ جا سکے لیکن وہ یہیں رہتے ہوئے فیضانِ نبوّت سے مستنیر ہوئے اور انہوں نے اسلام کو بچانے کے لئے سات آٹھ محاذوں پر جنگ لڑی - انہوں نے ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی جارحیت' بھگتی تحریک کی روز افزوں مقبولیت' علمائے سوء کے فساد' صوفیائے خام کی گمراہی' اکبر اور اس کے مصاحبوں کی بے دینی اور ایران سے تازہ وارد شدہ رفض و تفضیل کے خلاف مضبوط بند باندھے -

مغلوں کے آخری دورِ حکومت میں جب مرہٹوں' جاٹوں اور سکھوں کے مظالم بڑھے تو شاہ ولی اللہؒ' سیّد احمدؒ رائے بریلوی' شاہ اسمٰعیلؒ شہید اور مولانا عبد الحیؒ بڈھانوی نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اسلامی اقدار کو بچانے کے لئے صرف کر دیں - یہ بھی عجیب اتفاق

ہے کہ چاروں بزرگوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جاکر اپنی زندگیوں میں مقصدیت پیدا کی اور دین کی خدمت کا نیا جذبہ لے کر برعظیم واپس آئے - ان بزرگوں نے سرفروشی کے جذبات بیدار کئے اور پسے ہوئے مظلوم مسلمانوں میں عزم و ہمت کی ایک نئی روح پھونک دی - پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کیا خوب کہا ہے کہ برعظیم کی آزادی کی تحریک سے ان اثرات کو نکال دیجئے تو ایک وسیع خلا نظر آئے گا اور جذباتِ حریت کے منابع و مخارج کا پتہ لگانا مشکل ہو جائے گا-

۱۷۶۴ء میں انگریزوں نے شاہ عالم ثانی' میر قاسم اور شجاع الدولہ کی متحدہ فوج کو بکسر کے میدان میں شکست دے کر بنگال' بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرلی تو وہ عملاً اس علاقے کے حکمران بن گئے - انگریز تاجروں نے ہندو زمینداروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر قیامت ڈھادی تو اس مصیبت سے مسلمانوں کو نکالنے کے لئے حاجی شریعت اللہ اور میر نثار علی عرف تیتو میر نے رہنمائی فرمائی اور اتفاق دیکھئے کہ یہ دونوں بزرگ بھی برسوں حجازِ مقدس میں رہ کر اپنے اندر عملی روح پیدا کر چکے تھے -

۱۸۵۷ء میں حصولِ آزادی کی کوشش میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ فی الحال انگریزوں سے سیاسی اقتدار واپس لینا ممکن نہیں اس لئے اب دین اور علومِ دین کو بچانے 'فنڈر اور فورمین جیسے دریدہ دہن پادریوں اور دیانند سرسوتی جیسے بے باک و مادر پدر آزاد آریا سماجی رہنما کا مقابلہ کرنے کے لئے کام کرنا چاہئے - مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ پادریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں نکلے اور انہوں نے پادریوں کے چھکے چھڑا دیئے - بالآخر برطانوی حکومت پادریوں کی مدد کے لئے حرکت میں آئی تو مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے حجازِ مقدس میں پناہ لی - حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ 'معرکۂ شاملی میں حصہ لینے کے بعد انگریزوں کے انتقام سے بچنے کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے - اسی زمانے میں وہاں مدرسہ صولتیہ قائم ہوا جو برِعظیم کے علماء کے لئے جائے پناہ بن گیا - حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ علماء کرام میں سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ 'مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک نئے جذبے کے ساتھ میدانِ عمل میں کودے - یہ حضرات حجازِ مقدس جاکر قبلہ حاجی صاحب سے ہدایات وصول کرتے رہے اور وہیں سے روشنی لاکر برِعظیم میں پھیلاتے رہے - جب ان کی مساعیٔ جمیلہ سے آزادی کی منزل نظر

آنے لگی تو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، عبید اللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمدؒ مدنی اور علامہ شبیر احمدؒ عثمانی آگے بڑھے - شیخ الہندؒ مکہ مکرمہ میں مقیم رہے اور وہیں سے گرفتار کر کے مالٹا روانہ کئے گئے - حضرت مدنیؒ نے برسوں مدینہ منورہ میں روضۂ مبارک کے سامنے بیٹھ کر درسِ حدیث دیا - عبید اللہ سندھی نے تیرہ برس مکہ مکرمہ میں رہ کر شاہ ولی اللہ کی تصانیف کا مطالعہ کر کے اپنے دماغ کو صیقل کیا -

اس لمبی چوڑی تمہید کا مقصد یہ بتانا تھا کہ جن علماء کرام نے اس ملک میں مسلمانوں کی کشتی کو ڈوبنے سے بچایا ان کی زندگیوں میں مقصدیت کا شعلہ اسی وقت بھڑکا جب انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جا کر اپنی صلاحیتوں پر صیقل کیا اور وہ "رجوع الی القرآن و السنّۃ" کی دعوت لے کر برعظیم آئے - آج کی نشست میں مجھے فرائضی تحریکؒ کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے جس کے بانی حاجی شریعت اللہؒ "رجوع الی القرآن" کی دعوت لے کر اٹھے تھے -

حاجی شریعت اللہ ۱۷۸۱ء میں مشرقی بنگال کے ضلع فرید پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں بندر کھولہ میں پیدا ہوئے - ان کی ولادت سے ۲۴ سال پہلے جنگِ پلاسی میں بنگال کے مسلمانوں کے مقدر پر غلامی کی مہر لگ چکی تھی اور ۱۷ سال قبل بکسر کی جنگ میں انگریزوں نے شاہ عالم ثانی، میر قاسم اور شجاع الدولہ کو شکست دے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ۲۶ لاکھ روپے سالانہ کے عوض شاہ عالم سے خرید لی تھی - بنگال کی زرخیز زمینیں مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر ہندوؤں اور انگریزوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں - انگریز نیل کی کاشت اور اس کی یورپ کی منڈیوں میں برآمد میں دلچسپی رکھتے تھے اور ہندوؤں کو زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی سے سروکار تھا - نیل کی کاشت اور ہندوؤں کی ملکیت زمینوں کی کاشت غریب مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی - انگریز اُن کے منہ کا ایک ایک نوالہ چھین رہے تھے اور ہندو زمیندار اُن کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑنے پر تُلے ہوئے تھے - ان حالات میں حاجی شریعت اللہ کی تعلیم کہاں ہوتی؟ ان کا بچپن انتہائی عسرت اور افلاس میں گزرا - وہ مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھتے تو اُن کا دل کڑھتا اور وہ خون کے آنسو بہا کر خاموش ہو جاتے -

۱۷۹۹ء میں جب حاجی شریعت اللہ ۱۸ برس کے ہوئے تو مسلمانانِ برِعظیم کی امیدوں کا

آخری سہارا یعنی سلطنتِ خداداد میسور کا چراغ میر جعفر کے ہم مسلک و ہم مذہب میر صادق کی غداری کے سبب بجھ گیا- بقول علّامہ اقبال ان دونوں کی روحوں کو جہنم نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا- ان حالات میں شریعت اللہ برِّعظیم کے حالات سے بد دل ہو کر حجازِ مقدّس چلے گئے جہاں سے قومی خدمت کرنے والوں کے قلوب کو ضیاء ملتی تھی-

شریعت اللہ کے حجاز پہنچنے سے سات سال قبل عرب کے بدنام مصلح محمد بن عبد الوہاب انتقال کر چکے تھے- ان کے حجاز پہنچنے کے چار سال بعد مکہ مکرمہ ترکوں کے قبضے سے نکل کر وہابیوں کے قبضے میں چلا گیا- سقوطِ مکّہ کے دو سال بعد وہابی مدینہ منورہ پر بھی قابض ہو گئے- یوں اسلام کے ان دو مراکز میں نغمۂ توحید گونجنے لگا اور لوگ کتاب و سنّت کی جانب مائل ہوئے-

شریعت اللہ نے قیامِ مکہ کے دوران متعدد حج کئے اور وہاں کے علماء سے قرآن و حدیث کا درس لیا - وہیں موصوف امام ابنِ تیمیہؒ اور ابن القیمؒ کے نظریات سے متعارف ہوئے جو وہابیوں کے فکر کی اساس تھے - وہابیوں کو مکے پر قبضہ جمائے ہوئے ابھی دس سال ہی گزرے تھے کہ سلطانِ ترکی کے ایماپر مصر کے گورنر محمد علی نے حجاز پر حملہ کر دیا- اسی اثناء میں نپولین اتحادیوں کی قید سے فرار ہو کر فرانس پہنچ گیا- جس سے عالمی سیاست میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو گئی اور محمد علی اپنی مہم ادھوری چھوڑ کر مصر واپس چلا گیا- اس کے واپس جاتے ہی وہابیوں نے اس کے فرزند طوسون کو حجاز سے نکال دیا-

نپولین کو ۱۸۱۵ء میں واٹرلو کی جنگ میں فیصلہ کن شکست ہوئی تو اتحادیوں نے اطمینان کا سانس لیا- اگلے سال محمد علی نے اپنے بیٹے ابراہیم کو حجاز و نجد کی مہم سونپی اور اس نے ۱۸۱۷ء میں وہابیوں کی حکومت کا صفایا کر دیا- یہ سب کچھ حاجی شریعت اللہ کی موجودگی میں ہوا- انہوں نے مزید دو سال حجاز میں گزارے اور ۱۸۱۸ء میں اپنے وطن پہنچ گئے-

حجاز میں اٹھارہ انیس سالہ قیام کے دوران میں انہوں نے وہابیوں کو ظاہرہ شریعت پر عمل کرتے دیکھا اور کتاب و سنّت کے ساتھ اُن کے لگاؤ' رسوم و رواج سے نفرت اور شرک و بدعت کی مخالفت کو بہت قریب سے دیکھا اور دین کی اصل روح کو سمجھنے کی کوشش کی - موصوف یہی جذبہ لے کر برِّعظیم واپس لوٹے اور انہوں نے اپنی تحریک کا آغاز اپنے آبائی قصبے سے کیا-

اُن کی برعظیم سے غیر حاضری کے دوران میں یہاں کے مسلمانوں کی دینی' اخلاقی اور معاشی حالت مزید خراب ہوگئی تھی - جس سال وہ برعظیم سے گئے اسی سال جنوبی ہند میں سلطنتِ خداداد میسور کا چراغ گل ہوا اور اُسی سال لاہور پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہوا اور حاجی شریعت کی واپسی تک وہ دریائے ستلج سے لے کر جمرود تک اور سری نگر سے لے کر ڈیرہ غازی خاں تک اپنی ریاست کی حدود بڑھا چکا تھا - رنجیت سنگھ کے ماتحت علاقوں میں مسلمانوں کی حالت بڑی نازک تھی - کئی مقامات پر سکھوں نے مسجدوں پر قبضہ کر لیا تھا - بعض علاقوں میں اذان پر پابندی عائد تھی - ذبیحۂ بقر کی قطعی ممانعت تھی اور اسلامی شعائر مٹ رہے تھے -

اُدھر ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی سرکردگی میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور مغل بادشاہ لال قلعے کے اندر انگریزوں کے پنشن خوار کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگا - کلکتے سے لے کر سہارنپور تک انگریزوں کی عمل داری قائم ہوگئی - اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن گیا اور اسلامی شعائر مٹنے لگے - ان حالات میں سراج الہند شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے برِعظیم پاک و ہند کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا - دار الحرب ہونے سے بات محض نمازِ جمعہ اور عیدین کے عدمِ جواز تک ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ جذبۂ آزادی کو شعلہ بنانے کا اعلان تھا - اس کا یہ مطلب تھا کہ اب مسلمانوں کو اپنی اور اسلامی شعائر کی حفاظت کے لئے سروں پر کفن باندھ کر میدان میں کود پڑنا چاہئے -

اب ہم دوبارہ پیچھے کی طرف لوٹتے ہیں - جن دنوں حاجی شریعت اللہ حجازِ مقدس سے دعوت رجوع الی القرآن لے کر بنگال واپس لوٹے تو اُنہی ایام میں سید احمدؒ بریلوی' شاہ اسمٰعیلؒ شہید' علمائے صادق پور اور صدہا مجاہدین بنگال میں یہی دعوت لے کر پہنچے ہوئے تھے - حاجی شریعت اللہؒ ۱۸۱۸ء میں بنگال آئے اور سید احمد بریلویؒ اور ان کے رفقاء کلکتہ سے ۱۸۲۰ء میں حجِ بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے - روایت ہے کہ اس زمانے میں بعض مفتیوں نے سمندر پر انگریزوں کے تسلّط اور برِعظیم پر ان کے قبضے کے بعد پیدا ہونے والی صورت کے پیشِ نظر حج کے اسقاط کا فتویٰ داغ دیا تھا' اس لئے سیّد صاحب اسلام کے اس اہم رکن کی ادائیگی کے لئے حجازِ مقدس تشریف لے گئے لیکن انہوں نے حج پر روانگی سے قبل پٹنہ سے لے کر کلکتہ تک مسلمانوں کے مُردہ دلوں میں زندگی کی ایک نئی روح

پھونک دی تھی - بے نماز 'نمازی بن گئے اور مساجد میں نمازوں کے اوقات میں نمازیوں کو مساجد کے اندر جگہ نہ ملتی تھی - رمضان المبارک میں قرنِ اول کے ماہِ صیام کی یاد تازہ ہو جاتی تھی - بنگال و بہار بس ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کیا - 'آثار الصنادید' میں سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ جب تک سید صاحب کلکتہ میں مقیم رہے ' شراب مطلق نہ بکنے پائی اور کلال خانے بند رہے - اس کے نواح میں آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک ہو گئی -

اس تمہیدِ طولانی سے میرے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ سیّد صاحب اور اُن کے رفقاء حاجی شریعت اللہ کے لئے زمین ہموار کر گئے اور انہیں صرف بیج ڈالنے کی ضرورت پڑی -

حاجی شریعت اللہ کے ذہن میں یہ حدیث مبارک تھی کہ اسلام غریبوں سے شروع ہوا اور آخری دور میں غریبوں میں ہی رہ جائے گا - چنانچہ انہوں نے غریبوں 'کسانوں اور مزدوروں میں کام شروع کیا - انہوں نے رسوم و رواج کی بجائے اسلام کے فرائض بجالانے پر زور دیا اسی لئے ان کی تحریک کا نام فرائضی تحریک اور ان کے پیروکاروں کا نام فرائضی پڑ گیا - انہوں نے اپنے مریدوں میں دیانت داری 'احساسِ ذمّہ داری 'خودداری اور خود اعتمادی پیدا کی - ان کے پیروکار اپنی ان صفات کی بنا پر دوسرے مسلمانوں سے ممتاز تھے -

حاجی صاحبؒ نے تمام بدعات کو ایک ایک کر کے ختم کیا - بیاہ شادی اور غمی کے مواقع پر سادگی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی - انہوں نے اپنے مریدوں کو قدم قدم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرامؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کی وصیّت فرمائی -

زمانۂ حال کے جن مؤرخوں نے اس تحریک کا بغور مطالعہ کیا ہے 'ان کی یہ رائے ہے کہ اس تحریک کو محدود فقہی مسائل کے دائرہ میں دیکھنا' طریقۂ محمدیہ اور وہابی تحریکوں کے اختلافات کے پس منظر میں پیش کرنا ' یا محض نیل کے کاشت کار انگریزوں اور ہندو زمینداروں کے خلاف ان کی سعی کو محدود کر کے اس تحریک کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا - ان کے خیال میں اس تحریک کا دائرہ کار بہت وسیع تھا - اس کے مذہبی 'سیاسی اور اقتصادی پہلو بھی قابلِ غور ہیں - حاجی شریعت اللہ کی تحریک 'بنگال میں حریّت و آزادی کی وہ صدا تھی

جس نے بنگالی مسلمانوں میں وہ احساس و شعور بیدار کیا جس کے بغیر کوئی تحریک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی - حاجی صاحب کے جانشین دادو میاں کے خلاف مقدمۂ بغاوت میں بنگال کے انگریز کمشنر Dampier نے اس کا برملا اعتراف کیا تھا کہ فرائضیوں کا مقصد انگریزوں کو بنگال سے نکال کر وہاں اسلامی اقدار بحال کرنا تھا- اس کا یہ بیان "Trial of Dadu Mian" کے ضمیمے میں ۲۶ اور ۲۷ صفحات پر موجود ہے -

حاجی شریعت اللہ نے سانحۂ بالاکوٹ کے نو سال بعد ۱۸۴۰ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا- اس داعیٔ کبیر کی قبر دریائے میگھنا کے سیلاب میں بہہ گئی اور یوں اُن کے پیروکار قبر پرستی کی بدعت سے محفوظ رہ گئے -

حاجی صاحب کی وفات کے بعد فرائضیوں نے ان کے فرزندِ ارجمند محسن الدّین احمد المعروف بہ دادُو میاں یا بنگالی لہجے میں دَدُّو میاں کو تحریک کا سربراہ مقرر کیا- مسند نشینی کے وقت ددّو میاں کی عمر بیس اکیس برس سے زیادہ نہ تھی 'یعنی اگر وہ ہمارے دَور میں ہوتے تو ہنوز کرکٹ میچوں میں سنچریاں بنانے کے لائق ہوتے 'لیکن قدرت نے ان سے کچھ اور ہی کام لینا تھا- اس نوجوان مجاہد نے تحریک میں نئی قوت 'نیا جوش' نیا عزم اور فکری انقلاب پیدا کر دیا اور فرائضی سرگرم عمل ہو گئے -

ددّو میاں نے مشرقی بنگال کے متعدّد اضلاع کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے انتظامی یونٹ قائم کئے اور ہر یونٹ میں اپنا ایک بااختیار خلیفہ انتظامی امور کی نگرانی کے لئے مقرر کیا- میاں صاحب نے پیرو مرید کی رسمی اصطلاح کی بجائے استاد و شاگرد کی اصطلاح اپنائی اور اخوت پر زور دیتے ہوئے فرائضیوں کو بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی تلقین فرمائی- وہ فرائضیوں سے کہا کرتے تھے کہ انگریز غاصب حکمران ہیں لہٰذا اُن کی عدالتوں کے دروازے حصولِ انصاف کے لئے نہ کھٹکھٹاؤ- انہوں نے اپنے خلفاء سے کہا کہ وہ فرائضیوں کے جھگڑے اپنی سطح پر فیصل کر دیا کریں اور اگر کسی جھگڑے کی نوعیت سنگین ہو تو اسے مرکز میں بھیج دیا کریں -

اُن کے فرمان کے مطابق فرائضی کھانا پکاتے وقت ایک مٹھی چاول ایک برتن میں ڈال دیا کرتے تھے - مقررہ مدت کے بعد خلیفہ یا اس کا نمائندہ وہ چاول اکٹھے کر کے بیت المال میں جمع کرا دیتا- اسی مٹھی بھر چاولوں کے ساتھ جماعت کا پورا نظام چلتا تھا- مرکز کے

علاوہ مختلف مقامات پر مسافروں کے لئے لنگر جاری تھے اور فرائضیوں کے علاج معالجے کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا--

دودو میاں نے فرائضیوں سے کہا کہ وہ ہندو زمینداروں کو اُن ناجائز ٹیکسوں کی ادائیگی بند کر دیں جن کی آمدنی سے ہندو دُرگا پُوجا' رام نومی' جنم اشٹمی' کالی دیوی کی پوجا' رکھشا بندھن' دیوالی' دسہرہ اور شوراتری جیسے تہوار مناتے ہیں' جن میں بتوں کی پرستش ہوتی ہے- دودو میاں کے اس اعلان سے ہندوؤں میں ایک کھلبلی مچ گئی اور وہ فرائضیوں پر ظلم ڈھانے لگے- اس پر دودو میاں نے اعلان کیا کہ وہ ہندوؤں کی زمین کاشت کرنے کی بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تسلط بنجر علاقے کو زیر کاشت لائیں-

دودو میاں کا یہ اعلان قابلِ صد ستائش ہے کہ 'اَلاَرضُ لِلّٰہ' یعنی زمین خدا کی ملکیت ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بطورِ وارث اس پر قابض ہو- علامہ اقبال نے ان کے اسی اعلان کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے: ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں ' اللہ کی ہے یہ زمیں

وہ مؤرخین جنہوں نے اس تحریک کا عمیق مطالعہ کیا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ دودو میاں کے اس اعلان کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ زمین کا مالک وہی ہے جو اُس پر کاشت کرتا ہے' اس لئے کسی کو لگان' نذرانہ یا ناجائز ٹیکس وصول کرنے کا حق نہیں پہنچتا اور اس انقلابی اور جرأت مندانہ اعلان کا ایک پہلو یہ تھا کہ بنگال پر غیر ملکیوں کا قبضہ غاصبانہ ہے اور اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا-

دودو میاں اور علامہ اقبال' دونوں کی خدائے ستار و غفار مغفرت فرمائے' بڑے بھلے وقتوں میں اللہ کو پیارے ہو گئے' اگر وہ آج زندہ ہوتے تو کراچی کے درجنوں مفتی انہیں الارضُ لِلّٰہ کہنے کے جرم میں اسلام سے خارج کر دیتے-

پروفیسر خلیق احمد نظامی کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ دودو میاں نے فرائضیوں کے ساتھ مل کر متوازی حکومت کے تصوّر کو عملی شکل دی اور اسے تقویت پہنچائی- انہوں نے پنچائتیں اور عدالتیں قائم کر کے اور بیت المال بنا کر ایک مستقل نظامِ حکومت کی بنیاد ڈال دی-

مؤرخین لکھتے ہیں کہ دودو میاں دعوے کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ان کی ایک آواز پر پچاس ہزار فرائضی سروں پر کفن باندھ کر میدان میں نکل سکتے ہیں - فرائضیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ہندو زمینداروں اور نیل کی کاشت اور تجارت کرنے والے انگریزوں کو چونکا دیا - انگریزوں نے فرائضیوں کے خلاف کئی جھوٹے مقدمات قائم کر کے انہیں قید کی سزا دی - دودو میاں پر بھی بغاوت کا الزام عائد کر کے انہیں ایک مقدمے میں پھنسا دیا - انہی ایام میں ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی شروع ہو گئی تو انگریزوں نے دودو میاں کو جیل میں بند کر دیا - بلیک ہول کے حادثے کی آڑ لے کر سراج الدولہ کے خلاف فوج کشی کرنے والے انگریزوں نے دودو میاں کو ایسے بلیک ہول میں نظر بند رکھا کہ انہیں تپ دق کا موذی مرض لاحق ہو گیا اور انہیں اُس وقت رہا کیا جب وہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی طرح تپ دق کی آخری سٹیج میں تھے - ان کا انتقال ۱۸۶۲ء میں ہوا -

گو یہ تحریک دودو میاں کے اخلاف نے جاری رکھی لیکن انگریزوں اور ہندوؤں نے ان کی قدم قدم پر مخالفت کی - اس سے تحریک کا رنگ بدل گیا - تاہم اس تحریک نے جذبۂ حریت اور آزادی کو برقرار رکھا اور یہ انہی کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے کہ بنگال کے مسلمان دوسرے صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں سے کہیں زیادہ متدین ہیں بلکہ اب تو بھارت میں اکثر و بیشتر مساجد کے آئمہ بنگالی ہی ہیں - یہ محض حسنِ اتفاق نہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکے میں رکھی گئی - ڈھاکے کا مذہبی ماحول فرائضیوں کی وجہ سے بڑا پاکیزہ تھا اور وہاں کے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کا حقیقی درد تھا -

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات: ۵۶ سفید کاغذ، عمدہ طباعت؛ قیمت فی نسخہ -/۵ روپے

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

(۱۴)

منشورِ اسلام

ارتقاء کی نفسیاتی سطح پر تبدیلیاں

انسانی ارتقاء دو سطحوں پر ہوا ہے: ایک[۱] خالصتاً حیوانی سطح پر جس میں فطرت نے حیاناتی اصولوں یعنی انواع میں لمبے عرصے پر محیط تغیّر و تبدّل یا فوری تبدیلیوں کے تحت ارتقائی صورتیں اختیار کیں۔ دوسرے[۲] نفسیاتی سطح پر جس کی اعلیٰ ترین ارتقاء یافتہ شکل نبوّت ہے۔ مؤخر الذکر ارتقاء پہلی نوع کے ارتقاء ہی کی ایک مختلف سمت میں ترقی پذیری کی صورت ہے۔ شعور (یعنی خالق کائنات کی وہ قوّت جو کائنات میں جاری و ساری ہے) کی یہ خصوصیت ہے کہ نامساعدت اور مخالفت سے اس کی فعّالیت بڑھتی ہے۔ اسے جب کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اسے حد درجہ مخالفت درپیش ہے تو اس صورت میں وہ دفعتاً ایک غیر معمولی ارتقائی قدم اُٹھاتے ہوئے ایک زقند لگاتی ہے۔ حیوانی دنیا میں شعور کی اس قسم کی مساعی نے انواع میں اچانک تبدیلیوں کی شکل اختیار کی ہے، گویا بالکل معجزانہ طور پر ماقبل نوع کی ایک ترقی یافتہ اور مختلف نوع میں تبدیلی۔ عالمِ انسانی میں رکاوٹ اور مخالفت کے دوران شعور جب ایک غیر معمولی زقند لگاتی ہے تو اس صورت میں خود شعوری سے لبریز ایسے انسان معرضِ وجود میں آتے ہیں جنہیں ہم انبیاء کہتے ہیں۔ جب کسی معاشرے کے اعتقاد اور کردار میں اتنی پستی آجائے کہ وہ صحیح نصب العین کے تقاضوں کے خلاف کھلی بغاوت کرے تو اس کیفیت میں ارتقاءِ انسانی کی سطح پر شعور کو مخالفت کا سامنا ہوتا ہے اور وہ اس کا مقابلہ ایک غیر معمولی سعی سے کرتی ہے اور نتیجۃً اس معاشرے میں ایک ایسا شخص ظاہر ہوتا ہے جسے فطرت نے خود شعوری کا ایک خاص عطیہ عنایت کیا ہوتا ہے اور اس میں نصب العین

کی محبّت بتمام وکمال ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی صحیح نصب العین کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے ان کے دِلوں میں اس کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور انہیں از سرِ نو ارتقاء کے راستے پر ڈالتا ہے ایسا شخص منصبِ نبوّت کا حامل ہوتا ہے۔ اخلاقی طور پر تنزّل پذیر معاشرے میں کسی نبی کی اچانک بعثت ایسی ہی ہے جیسے اس جگہ طوفان کا آنا جہاں فضا میں ہوا کا دباؤ بہت کم ہو جائے یا جیسے کسی بیماری کے پیشِ نظر کسی جاندار ہستی کا ایسا غیر ارادی فعل جس سے دوبارہ صحت بحال ہو جائے۔

اس ضمن میں دوسرا سوال[1] جو قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ کیا تمام انبیاء مساوی طور پر خود شعوری کا وصف رکھتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ان کی تعلیمات میں فرق و تفاوت کیوں ہے باوجودیکہ ان کی تعلیمات کی بنیاد ایک ہی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انتہا درجے کی خود شعوری رکھنے کے اعتبار سے تمام انبیاء یکساں ہیں اور ان میں کوئی اُونچ نیچ نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ہر نبی انسانیت کو صحیح نصب العین کے عملی تقاضوں کی تعلیم دیتا ہے لیکن ہر نبی کا علم و عرفان اُس معاشرے کے ذہنی، اخلاقی اور مادی کوائف کے متناسب ہوتا ہے جس میں وہ مبعوث کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار بالخصوص کسی بھی نبی کی عملی تعلیمات کے نمونے میں ملتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کی تعلیمات میں فرق اسی سبب سے ہے۔ چونکہ مختلف معاشرے مختلف ادوار میں ارتقاء کے مراحل سے گزرتے رہے ہیں اس لیے کسی نبی کے لیے بھی یہ ضروری نہ تھا کہ وہ صحیح نصب العین کا اطلاق زندگی کے ہر گوشے مثلاً قانون، تعلیم، اقتصادیات، جنگ، انفرادی و اجتماعی زندگی وغیرہ کے لیے حتمی اور آخری درجے میں بتائے۔ اس کی تعلیمات معاشرے کی عمومی ارتقائی صُورت کے مطابق ہوتی تھیں۔ چنانچہ خود انبیاء کی تعلیمات میں بھی ارتقاء ہوا ہے تاکہ وہ فرد اور اجتماع دونوں کو اپنے ارتقائی مرحلے کی مناسبت سے راست نصب العین کے لیے راہنمائی فراہم کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بنیاد اور ماخذ کے باوجود انبیاء کی تعلیمات میں فرق و امتیاز ہے۔ یہ فرق مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں

---

[1] اس سلسلے کا پہلا سوال اور اس کا جواب کہ رسالت کی غرض و غایت اور اس کا سبب کیا ہے گزشتہ قسط کے اختتام پر دیکھا جا سکتا ہے، جو اگست ۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر۳: نبوّت کے اختتام تکمیل کا کیا سبب ہے؟ اگر نبوّت کے ذریعے فطرت ارتقاء کی مدد کرتی ہے تو یہ انسان کے ارتقاء کے آخری مراحل سے قبل کیوں منقطع کر دی جاتی ہے؟

جواب: تخلیق کی نفسیاتی سطح پر کسی طبعی نصب العینی معاشرے کی مثال تخلیق کی حیاتیاتی سطح پر کسی طبعی نوع جیسی ہے۔ جس طرح نئی حیاتیاتی نوع کا پہلا فرد ایک مخصوص نوع کے آغاز کا باعث بنتا ہے اسی طرح نفسیاتی سطح پر ایک نئے انسان یعنی نبی کی آمد اور اس کے متبعین ایک مخصوص نصب العینی کمیونٹی کی تخلیق کرتے ہیں۔

حیاتیاتی سطح پر تغیّر و تبدّل کا انقطاع

حیوانی دنیا میں انواع میں فوری تغیّر و تبدّل کا عمل اس وقت ختم ہو گیا جب ایسا نامیاتی وجود منصّۂ شہود پر آ گیا جس میں از خود مستقبل میں ارتقاء کے تمام امکانات موجود تھے یعنی جس کا دماغ اتنا ترقّی یافتہ تھا کہ وہ شعور میں موجود گوناں گوں عواطف و میلانات کے اظہار کے قابل تھا، اور مستقبل میں ان کے ارتقاء کی ضمانت بھی دے سکتا تھا۔ ایسے نامیاتی وجود کا کامل ترین نمونہ حیاتِ انسانی ہے۔ اس نوع کے متشکّل ہونے کے بعد شعور نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کسی اور اعلیٰ تر نوع کی صورت گری کے لیے کوئی غیر معمولی جست لگائے، کیونکہ اس کے داخلی ارتقاء کے لیے کوئی بندش اور تحدید نہ تھی۔ چنانچہ نئی انواع کے لیے تخلیقی عمل خود بخود منقطع ہو گیا۔

نظریاتی سطح پر تغیّر و تبدّل کا انقطاع

بالکل اسی طرح عالمِ انسانی میں اس کے متوازی مظہر یعنی نبوّت کو بھی منقطع ہونا چاہیے۔ اور بالفعل یہ اُس وقت ہوا جب ایسے نبیؐ کی بعثت ہوئی جس کی تعلیمات ہر اعتبار سے مکمل تھیں، نفسیاتی اور نظریاتی ہر دو اعتبار سے مستقبل میں تمام مواقع کے لیے راہنمائی فراہم کر سکتی تھیں، اور فطری انسانی صلاحیت کو انسانی زندگی کے جملہ گوشوں میں راست نصب العین سے مربوط کر سکتی تھیں۔ اس نبیؐ کی اپنی عملی مثال پوری انسانیت کے لیے ہمیشہ کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ ظاہر ہے

کہ ایسے نبی کا اسوۂ حیات ایسا ہونا چاہیے جس میں حیاتِ انسانی کے ارتقاء پر کوئی قدغن نہ آئے بلکہ وہ اپنی کامل ترین صورت میں متشکل ہو سکے۔ ایسے نبی کے اسوہ کا اتباع معاشرے کے عمومی ارتقاء میں نہ صرف ممد ہوتا ہے بلکہ اسے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتا ہے۔ اس نبی کی بعثت کے بعد کسی اور نبی کے آنے کی چنداں حاجت نہیں رہتی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں نہ صرف نبوّت کی تکمیل ہوئی، یہ اختتام پذیر بھی ہوئی۔ آپؐ کی تعلیمات میں بالقوّہ یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تاقیامِ قیامت انسانیت کے ہمہ جہتی ارتقائی عمل کے لیے راہنمائی دے سکے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی گوشے میں بھی رکاوٹ یا جمود کا باعث نہ بنے۔ اب یہ آنحضورؐ کی اُمّت کا فرض ہے کہ وہ ان تعلیمات کا نور چار دانگِ عالم میں پھیلائے اور پوری دنیا میں حق کا بول بالا کرے۔ اور اسی آخری فطری ہدایت کے لیے مقدّر ہے کہ وہ پورے عالم پر چھا جائے جس طرح حیوانی عالم کے ارتقائی تغیّر و تبدّل میں انسان کا ظہور اس امر کا اعلان تھا کہ وہ اپنی نوعی اور دماغی افضلیت کی وجہ سے اپنے اقتدار کا سکّہ پورے حیاتیاتی عالم پر جمائے گا، اسی طرح نبی آخر الزماں و خاتم الانبیاءؐ کے پیروکار اپنی فکری و نظری فضیلت کی بنا پر پوری دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہونگے۔

تکمیل و اختتام: عمومی فطری قانون

شعور یا حیات کا نبوّت کا سلسلہ مکمل کر کے منقطع کر دینا صرف مظہرِ نبوّت سے مختص نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عمومی اصول کے طور پر ہر جگہ کارفرما ہے۔ ہر تخلیقی عمل اپنی انتہائی اور کامل ترین شکل پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ جب کوئی انتہائی صورت متشکّل ہوتی ہے تو تخلیقی عمل کی ماہیت بدل جاتی ہے اور وہ ایک دوسری سمت میں ارتقائی سفر شروع کر دیتا ہے جس کے لیے پہلی تکمیلی صورت بمنزلہ بنیاد ہوتی ہے۔ پھر قدم بہ قدم یہ ارتقائی عمل اس جہت کی اکمل ترین صورت کی طرف بڑھتا ہے اور اس طرح یہ عمل سدا رواں دواں رہتا ہے۔

فردِ انسانی کے عملِ نمو میں نقطہ ہائے کمال

ہم اپنی نگاہ فردِ انسانی کے ارتقائی و نموی عمل سے کائناتی ارتقاء کی طرف لے جائیں تو

ہمیں ان دونوں میں مندرجہ بالا ایک ہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

مادی سطح پر ارتقائی عمل اپنے نقطۂ عروج اور تکمیل کو اس وقت پہنچا جب وہ تیاری کے جملہ مراحل سے گزر کر نامیاتی خلیہ پیدا کرنے کے قابل ہوا اور پہلا نامیاتی خلیہ معرضِ وجود میں آیا۔ وہ ارتقائی عمل جو اب تک باعتبار نوعیّت صرف طبعی یا کیمیائی قسم کا تھا اب بدل کر حرکی یا حیاتیاتی نوعیت اختیار کر گیا۔ بعد میں خود یہ نامیاتی خلیہ ترقی کرتے کرتے اس قابل ہوا کہ اس کی تکمیل ایک ایسے انسان کی پیدائش کی صورت میں ہوئی جس کا دماغ مکمل طور پر وضع شدہ تھا اور اس میں نصب العینوں کی محبّت کا جذبہ بھی موجود تھا۔ پہلا تکمیلی مرحلہ مؤخّر الذکر تکمیلی مرحلے کے لیے شرط لازم تھا کیونکہ انسانی جسم بے شمار نامیاتی خلیوں ہی کا مجموعہ ہے۔ انسان کے وجود میں آنے کے بعد ارتقائی عمل نے اپنی نوعیّت بدلی اور حیاتیاتی سطح سے آگے بڑھ کر نظریاتی یا نفسیاتی سطح پر اپنا سفر جاری رکھا تا آنکہ دنیا میں پیغمبروں یعنی نصب العینی انسانی معاشروں کے اماموں (Leaders) کی آمد ہوئی پھر شعورِ نبوّت میں بھی ارتقاء ہوا حتیٰ کہ آخر میں خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور آپؐ نے مکمل ترین نصب العینی کمیونٹی تشکیل دی۔ گویا ارتقاء کا ہر پہلا نقطۂ عروج دوسرے عروج کے لیے بنیاد بنا اور پھر دوسرا تیسرے ارتقائی عمل کے نقطۂ عروج کے لیے بنیاد بنا۔ اور یہ تیسرا نقطۂ تکمیل اُس وقت تک اپنا عمل جاری رکھے گا جب تک کہ پوری انسانیت من حیث المجموع اپنے نقطۂ کمال تک نہیں پہنچ جاتی۔

خاتم الانبیاء کا دین: بعد کے فکری ارتقاء کی ناگزیر بنیاد

جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے ہمیں فطرت کے تخلیقی عمل میں درجہ بدرجہ نقطہ ہائے کمال نظر آتے ہیں۔ ہر نقطۂ کمال ماقبل ارتقائی عمل کا نقطۂ عروج اور بعد میں وقوع پذیر ہونے والے عمل کے لیے اساس فراہم کرتا ہے۔ ارتقائی عمل کا انداز ایک وحدت کا سا ہوتا ہے یعنی اس کے مختلف اجزاء باہم دگر اتنے مربوط ہوتے ہیں کہ وہ ایک کُل کی حیثیت سے سرگرم عمل رہتا ہے اور ارتقائی عمل میں مختلف مدارج پر مظاہر اس کُل کے ساتھ ربط کے حوالے سے بامعنی بنتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض مظاہر مرکزی وحدانی ساخت سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کی

حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور اصل اہمیت ان مظاہر ہی کی ہوتی ہے جو اصل ارتقائی شکل سے ہم آہنگ ہوں۔ اس استدلال کا لازمی نتیجہ نہ صرف یہ نکلتا ہے کہ نبوت کو بھی لامحالہ کسی نبی کی ذات میں تکمیل اور اختتام تک پہنچنا ہے، بلکہ یہ بھی کہ اس خاتم الانبیاء کا اسوہ مستقبل میں انسانی حیات کے ہمہ جہتی ارتقاء کے لیے اساس فراہم کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت نسل انسانی کی وحدت اور اس کے مسلسل و پیہم ارتقاء کے لیے شرط لازم ہے۔ اگر سلسلہ نبوت کا اہتمام نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نسل انسانی میں نہ وحدت پیدا ہو گی اور نہ ہی اس کے تہذیبی طور پر مستقل نشوونما کی ضمانت ملے گی۔ صرف صحیح نصب العین سے تعلق کی وجہ سے وہ اساس حاصل کی جا سکتی ہے جس کو اپنانے سے پوری نوع انسانی ایک وحدت کی لڑی میں پروئی جا سکتی ہے۔ اور صرف نبی آخر الزماں کی تعلیمات میں وہ جامعیت ہو سکتی ہے جو اس وحدت کو ممکن بنا سکے۔

ذہن انسانی کا زائیدہ مذہب انسانوں کو ایک وحدت میں نہیں پرو سکتا

بعض مفکرین نے انسانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی ہے کہ تمام ادیان عالم کے مشترک نکات کو اکٹھا کر کے ایک نیا مذہب اختراع کیا جائے۔ لیکن اس بات کے علاوہ کہ یہ تجویز عملی مشکلات رکھتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے خود ساختہ مذہب پر انسانیت نہ کبھی جمع ہو گی اور نہ ہی اسے صحیح معنوں میں اپنائے گی۔ اس قسم کا خود ساختہ مذہب انسان میں معبودِ حقیقی کی محبت پیدا کرنے سے بھی قاصر رہے گا۔ صرف ایک ایسا دین ہی جسے خالق کائنات نے کسی چنیدہ بندے پر اتارا ہو اور اس نبی نے اسے عملاً نافذ کیا ہو ——— لوگوں کے دلوں میں اپنے ربّ کی حقیقی محبت و عبودیت کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔ وحدتِ ادیان کا فلسفہ اگرچہ تاریخ میں کئی بار پیش کیا گیا ہے، لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ کسی ایسے فلسفیانہ مذہب کے پیروکار تعداد میں معتدبہ ہوئے ہوں یا وہ زیادہ عرصے تک قائم رہ سکا ہو۔ کسی بھی ایسے مذہب کے عقیدت مند رفتہ رفتہ اتنے کم ہو جاتے ہیں کہ اس کا وجود بھی تاریخ کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے دوغلے جانور کی ہے جو اپنی نسل خود قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہر ایسا غیر فطری نظریۂ حیات جو بذریعہ وحی انسان کو نہ دیا گیا ہو، لامحالہ کسی سیاسی دانشور فلسفی یا روحانی شخص کی طرف سے آئے گا۔

اور اس کے ذہن و فکر کی محدودیت اس میں در آئے گی۔ ایسے مذہب عام طور پر کسی نبی کی جزوی تعلیمات اور فکر انسانی کی آمیزش سے بنائے جاتے ہیں لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ایسے مذاہب اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں بالکل ناکام رہتے ہیں۔ صرف سچے انبیاء کی تعلیمات ہی میں وہ نظریۂ حیات پایا جاتا ہے جو ایک ایسا انسانی معاشرہ ترتیب دے سکے جس میں انسانیت کی بڑی تعداد کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت ہو، اور جو انسانی ارتقاء کے لیے لامحدود فعتوں کی ضمانت دے سکے۔ اور بالخصوص خاتم الانبیاء کی تعلیمات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے جس میں تمام خطّوں اور طبائع کے انسانوں کے لیے ہدایت ہوتی ہے اور وہ یہ صلاحیت رکھتی ہیں کہ پوری نوع انسانی کو ایک دین حق پر جمع کیا جا سکے۔ چونکہ اس دین میں انسانی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے متعلق راہنمائی ہوتی ہے، اس لیے ارتقاء انسانی کی مکمل ضمانت اس میں دی جاتی ہے۔ اس نبی آخر الزماں سے قبل تمام نبی صرف مخصوص قوموں کی طرف مبعوث کیے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کی نوعیت بھی ایسی نہیں ہوتی کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں۔ گویا ان کی مثال جانوروں کی ان نامکمل طبیعی انواع کی طرح ہے جو حالات کی نامساعدت کی وجہ سے اپنا وجود باقی نہ رکھ سکے اور ناپید ہو گئے۔ خاتم الانبیاء کی تعلیمات کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ اپنے ماقبل انبیاء کی تعلیمات کے بنیادی اور مرکزی تصورات کی جامع ہوتی ہیں۔ چنانچہ انبیاء کو دیئے گئے عملی احکامات یعنی شریعتوں میں تو فرق ہوتا ہے لیکن بنیادی نظری تصورات سب میں یکساں ہوتے ہیں اور نبیِّ خاتم کی شریعت اس اعتبار سے جامع اور مکمل ہوتی ہے کہ اس میں تا قیام قیامت انسانیت کے جملہ مسائل کا حل موجود ہے اور رہتی دنیا تک تمام لوگ اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۴ : ہمیں نبی آخر الزماںؐ ہی کی پیروی کیوں کرنی چاہیئے اور آپؐ ہی کے بتائے ہوئے طریقۂ عبادات کو کیوں اپنانا چاہیئے ؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اصولی طور پر تمام انبیاء کی بنیادی تعلیمات کی پیروی تو کریں لیکن نماز اور عبادات کی ظاہری شکل میں کسی کا اتباع نہ کریں ؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ عبادات کا نظام، ان کی شکل اور اوقات ہم اپنی مرضی، حالات اور سہولت کو مدّنظر رکھتے ہوئے مقرر کر لیں ؟

جواب : خالقِ کائنات سے محبّت اور ربط و تعلّق کو استوار کرنے کے لیے نبی کی تعلیمات پر من حیث الکل عمل اور اس پر ایمان ناگزیر ہے۔ ہم بحیثیتِ فرد اور بحیثیتِ اجتماع اس وقت تک خوشگوری

کا ارتقاء حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہم وقت کے نبی کا کامل اتباع نہیں کرتے۔ نبی پر ایمان اور اس کا کامل اتباع گویا ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص اس کے توسّط سے روحانی بالیدگی کی اعلیٰ ترین سطح حاصل کرے۔ جس طرح ایک گرم شے کو چھُونے سے حرارت دوسری شے میں منتقل ہوتی ہے یا ایک چراغ کی حرارت دوسرے چراغ کو روشن کر دیتی ہے، اسی طرح نبی سے تعلق اس کے متبعین میں ایمانی نور و حرارت منتقل کرتا ہے۔ نبی اپنی روحانی رفعت کا کچھ حصّہ اپنے صحابہ اور صحابہ بعد کے آنے والے لوگوں میں درجہ بدرجہ منتقل کرتے ہیں۔ گویا عشق و محبّت کا نور پہلے ایک نقطہ پر مرتکز ہوتا ہے اور پھر پورے ماحول کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ اور یہ مرکزی نقطہ ہمیشہ کسی نبی کی ذاتِ مبارکہ ہوتی ہے۔

اس حقیقت کی تعبیر یُوں بھی کی جا سکتی ہے کہ سلسلۂ نبوت ایک حیاتیاتی ضرورت ہے جو حیاتیاتی سطح پر جوشِ حیات اپنے انواع کی کثرت، مخالف جنسوں میں کشش اور اختلاط سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ تمام بنی نوع انسان کے افراد ایک ہی انسانی جوڑے کی اولاد ہیں اور یہی سبب ہے کہ وہ سب جسمانی ساخت اور اعضاء کی بناوٹ میں مماثلت رکھتے ہیں۔ جوشِ حیات کے پھیلاؤ کا عمل نفسیاتی سطح پر بھی جاری رہتا ہے اور وہ یوں کہ قافلۂ انسانیت کے کچھ افراد نبوت سے سرفراز کیے گئے ہیں اور لوگ فطری طور پر ان کے طریقے اپنا کر روحانی و نفسیاتی بالیدگی حاصل کرتے ہیں۔ گویا نظریاتی اعتبار سے نبی کی حیثیّت اپنے امتیوں کے لیے جدِّ امجد کی ہوتی ہے اور وہ سب اس کا اتباع کر کے دین سے رشتہ استوار کرتے ہیں۔ معاشرت، قانون اور اخلاق میں ایک جیسے قوانین پر عمل کر کے ان سب میں ایک وحدت کا احساس پیدا ہونا فطری ہے۔ جس طرح ایک نامیاتی خلیہ دوسرے نامیاتی خلیے کو جنم دیتا ہے، اسی طرح نظریاتی عالم میں ایک نبی کی دعوت دوسرے نبی کی تعلیم و دعوت کی بنیاد بنی تا آنکہ اس سلسلہ کے اختتام پر نبی آخر الزماںؐ کی دنیا میں آمد ہوئی۔

جو شخص مکمل طور پر اور غیر مشروط طور پر نبی پر ایمان لا کر اس کا اتباع کرتا ہے، وہ گویا ایک طرح سے نئی زندگی کا آغاز کر کے نفسیاتی اور نظریاتی اعتبار سے ترقی و کمال کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اس شخص کی مثال اس جنین کی سی ہے جو ایک دَور میں مکمل طور پر اپنی ماں پر انحصار کرتا ہے اور پھر اپنی جُداگانہ زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ پھر جس طرح بچّہ آغاز میں اپنی ماں کے دُودھ سے غذا حاصل کرتا ہے، اسی طرح ایک صاحب ایمان و یقین نبی کے کامل و اکمل اسوہ پر عمل کر کے اور اس کے علم و

عرفان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے روحانی سفر کا آغاز کرتا ہے۔ نبی کے بتائے ہوئے اوامر و نواہی پر وہ مسلسل عمل جاری رکھتا ہے حتیٰ کہ وہ اسے خارج سے ٹھونسے ہوئے احکام نہیں بلکہ خود اپنے دل کی آواز اور فطرت کا تقاضا محسوس ہونے لگتے ہیں اور نبی کا بتایا ہوا خیر و شر کا فرق اسے اپنے باطن سے اُبھرتا معلوم ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو حاصل کر لینے کے بعد نبی کی اطاعت اسے چنداں گراں نہیں گزرتی بلکہ اس کے دل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شدید محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ روحانی ارتقار کے اس مرحلے پر وہ اپنے کردار و اعمال اور شب و روز کے معمولات میں نبی اکرمؐ سے اسی طرح کی کامل مشابہت اختیار کر لیتا ہے جیسی ایک باپ اور بیٹے کے مابین ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر نبی کے مخلص اور حقیقی متبعین اس کی نظریاتی اولاد کی مانند ہوتے ہیں۔

خالقِ کائنات کا پیغام — نوعِ انسانی کے نام

قرآن مجید، فرقانِ حمید

کے علم و حکمت سے واقفیت حاصل کرنے اور یہ جاننے کے لیے کہ ہمارا دین ہم سے چاہتا کیا ہے!

ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی

کے دروسِ قرآن اور خطاباتِ عام

کے پانچ سو سے زائد آڈیو / ویڈیو کیسٹس سے

بالکل مفت استفادہ کیجیے

نشر القرآن کیسٹ لائبریری

۳۶ رسوک سنٹر۔ نیو گارڈن ٹاؤن لاہور۔ فون: ۸۵۷۵۷۳

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور رحمۃ للعلمین ﷺ

ایک رحمۃ للعلمینؐ کی ضرورت

چونکہ غلط تصوراتِ حسن حق و باطل اور حسن و غیر حسن کے امتزاجات اور مرکبات پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان کی کثرت کی کوئی حد نہیں ہو سکتی، لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں نوع انسانی کو کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کا صحیح اور سچّا نصب العین کیا ہے۔ فلسفۂ خودی کا جواب یہ ہے کہ خدا خود نوعِ انسانی کی رہنمائی کا اہتمام کرتا ہے اور اس اہتمام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ انبیاء کا ایک سلسلہ پیدا کرتا ہے جو کامل نبی یا رحمۃ للعلمین پر ختم ہوتا ہے۔ یہ کامل نبی یا رحمۃ للعلمین پہلے انبیاؑ کی طرح نوعِ انسانی کو نہ صرف یہ بتاتا ہے کہ ان کا سچّا نصب العین خدا ہے بلکہ تعلیم نبوّت کو درجۂ کمال پر پہنچا کر انبیاء کے سلسلہ کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی نظری تعلیم اور اپنی عملی زندگی کے نمونہ سے خدا کے تصوّر کو انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر جسپاں کرنے کی وجہ سے ایک کامل نظریۂ حیات وجود میں لاتا ہے جو نوعِ انسانی کے ارتقاء کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے اور اُن کو زندگی کے تمام شعبوں میں حسن و کمال کی انتہا تک پہنچانے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے بعد کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ رحمۃ للعلمین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن پر قرآن حکیم نازل ہوا ہے اور جن کا عطا کیا ہوا کامل نظریۂ حیات اسلام کہلاتا ہے۔

تخلیقِ عالم کے تین مرحلے

اقبالؔ ہمیں بتاتا ہے کہ جب بھی خدا کوئی ہنگامۂ عالم برپا کرتا ہے یا جہانِ رنگ و بُو پیدا کرتا ہے تو خدا کی ازلی اور ابدی صفات کے تقاضوں کی وجہ سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس

کی خاک سے خدا کی آرزو یا محبت کا جذبہ نمودار ہو۔ یعنی اس کا مدعا انسان کی طرح کی ایسی مخلوق کی تخلیق اور تکمیل ہوتا ہے جو ہمہ تن خدا کی آرزو یا محبت ہو۔ لہٰذا اس ہنگامۂ عالم یا جہانِ رنگ و بُو کے لیے آخر کار ایک رحمۃ للعٰلمین یا کامل نبی کا وجود ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ اپنی تعلیم اور اپنی عملی زندگی کے نمونہ کے اثر سے خدا کی محبت کی تربیت کر کے اس کو درجۂ کمال پر پہنچائے۔ چونکہ ضروری ہوتا ہے کہ یہ مخلوق آخر کار ایک ایسی خودی یا شخصیت کی صورت اختیار کرے جو ایک مکمل مادّہ سے تعمیر پائے ہوئے مکمل جسمِ حیوانی میں جاگزیں ہو اور جس کا حسن اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ لہٰذا اس مخلوق کی تکمیل تین مرحلوں میں انجام پاتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس کی تکمیل کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس مادّہ یا مٹی کو جس سے اس کا جسم تیار ہونا ہے مکمل کر لیا جائے۔ لہٰذا اس جہانِ رنگ و بو کی تخلیق کے پہلے مرحلہ یا پہلے دورِ ارتقاء کا مقصد مادّہ اور اس کے قوانین کی تکمیل ہوتا ہے۔ اس دور کی تخلیقی کارروائی کو قرآن حکیم نے "تقدیر" یعنی اندازوں کے تقرر کا نام دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادہ اور اس کے قوانین کی تکمیل کے ہر مرحلہ پر ریاضیاتی اندازوں اور حسابوں کا تعین عمل میں لایا جاتا ہے۔ مادّہ کی تکمیل کے بعد اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو جسمِ حیوانی اس مادہ سے تیار ہونا ہے اسے مکمل کیا جائے۔ اور اسے بروقتِ ضرورت خود بخود عمل کرنے کے ایسے طریقے سکھا دیئے جائیں جو جبلّتوں کی صورت میں جسمِ حیوانی میں راسخ ہو جائیں، تاکہ حیوان خود بخود اپنی زندگی اور نسل کو قائم رکھ کر ترقی کے مدارج طے کرے اور پھر اس قدر مکمل ہو جائے کہ خودی کا مقام اور مسکن بن سکے۔ چونکہ اس دور کی تخلیقی کارروائی کا مقصد حیوان کے اندرونی جبلّتی تقاضوں کو راسخ کرنا ہے لہٰذا خدا نے قرآن حکیم میں اس کو "ہدایت" یعنی بدنی اور حیاتیاتی ضرورتوں کی تشفی کے طریقوں کی راہنمائی کا نام دیا ہے۔ پھر جب خودی جسمِ حیوانی میں پیدا ہوتی ہے تو اس مخلوق کی تکمیل کا آخری دور شروع ہوتا ہے اور اس دور میں خودی ایک رحمۃ للعٰلمین یا مصطفٰےؐ کی نظری تعلیم اور عملی زندگی کے نمونہ کو سامنے رکھ کر اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی یعنی خدا نے کائنات کی تخلیق اور اس کا تسویہ کیا اور اس کی تخلیق کو تقدیر اور ہدایت کے دو ابتدائی مرحلوں سے گزارا ہے (اور اب اس کی تخلیق کا تیسرا مرحلہ ایک رحمۃ للعٰلمین کے ظہور سے شروع ہے)۔ غرضیکہ ہم جہاں بھی کوئی جہانِ رنگ و بو دیکھیں وہ یا تو ابھی اپنے ارتقاء کی ان ابتدائی منزلوں کو طے کر رہا ہوگا جن کو تقدیر اور ہدایت کی منزلیں کہنا چاہیے اور جن کے بعد ہی

اس میں کسی رحمۃ للعلمین یا مصطفیٰؐ کا ظہور ہو سکتا ہے۔ اور یا پھر اس میں کوئی رحمۃ للعلمین ظہور پا چکا ہوگا۔ اور وہ اس کے نور سے منوّر ہو رہا ہوگا۔ اقبال نے اس مضمون کو چار شعروں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعلمینے ہم بود
خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست — رحمۃ للعلمینے انتہا ست
ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہا ست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ ست

نبوّت کیوں ختم ہو جاتی ہے

بعض لوگوں نے ابھی تک نہیں سمجھا کہ نبوّت جس کا مقصد نوعِ انسانی کی ہدایت ہے آخر کار کسی ایک نبی پر کیوں ختم ہو جاتی ہے۔ اور کیوں جب تک نوعِ انسانی باقی ہے اور راہ نمائی کی ضرورت محسوس کرتی ہے یعنی تا قیامت جاری نہیں رہتی۔ لیکن اگر ہم نبوّت کی حقیقت کو ٹھیک طرح سے سمجھ لیں تو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔

نبوّت کی حقیقت

نبوّت اور وحی کی حقیقت کے متعلق علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"نبی روحانی تجربہ رکھنے والا ایک ایسا انسان ہوتا ہے جس کی ذات میں خدا سے ملاپ کا احساس اپنی حد سے گزر کر بہہ نکلنے پر مائل ہوتا ہے اور جماعتی زندگی کے محرکات کی نئی تشکیل اور راہنمائی کے مواقع تلاش کرتا ہے۔ اس کی شخصیت میں زندگی کا محدود مرکز اپنی غیر محدود گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تاکہ پھر نئی قوت کے ساتھ ابھرے اور زندگی کی فرسودہ راہوں کی بیخ کنی اور اس کی نئی راہوں کی نشاندہی کرے۔ اپنے وجود کی اصل کے ساتھ اس قسم کا رابطہ انسان کے ساتھ خاص نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وحی کا لفظ جس طرح سے قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک وحی زندگی کی ایک ہمہ گیر خاصیت ہے، اگرچہ ارتقائے حیات کے مختلف مرحلوں میں اس کی ماہیت یا کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک پودا جو اپنی

نوع کی موروثی شکل یا بناوٹ سے آزاد ہو کر فضا میں اگتا ہے، ایک جسم حیوانی جو ایک نئے ماحول کی رعایت سے ایک ایسا نیا عضو پیدا کر لیتا ہے جو اس کے باپ دادا کو حاصل نہیں تھا یا ایک انسان جو خودی کی اندرونی گہرائیوں سے علم کی روشنی حاصل کرتا ہے یہ سب وحی کی مختلف صورتیں ہیں جن کی ماہیت وحی پانے والے فرد کی ضرورت کے مطابق یا اس نوع کی ضرورت کے مطابق جس کا وہ فرد ہوتا ہے بدل جاتی ہے۔"

مظہرِ تقلیب

ایک پودے یا جسمِ حیوانی کا اس طرح سے نشوونما پانا کہ اس کی موروثی شکل و صورت بدل جائے اور وہ ایک نئی نوع کا جدِ اوّل بن جائے ایک حیاتیاتی مظہرِ قدرت ہے جسے حیاتیات کی زبان میں تقلیب یا نوع کا فوری تغیّر کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی کی خاصیات کا ایک تقاضا تھا کہ حیاتیاتی مرحلۂ ارتقاء میں تقلیبات بار بار اور نہایت کثرت کے ساتھ رونما ہوتی رہیں حیوانات اور نباتات کی رنگارنگی اور بوقلمونی جو آج اس کثرت کے ساتھ دیکھنے میں آرہی ہے ان ہی تقلیبات کا نتیجہ ہے۔ اقبال کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اقبال کے نزدیک نبوّت کا نظریاتی مظہر اسی حیاتیاتی مظہر کی ہی ایک مختلف اور انسانی مرحلۂ ارتقاء سے مناسبت رکھنے والی شکل ہے، جسے ماہرینِ حیاتیات نے تقلیبات یا انواع کے فوری تغیّرات کا نام دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم قدرت کے مظہرِ تقلیبات کے اسباب اور اس کی کیفیات کا تجزیہ کر کے اس کے سارے علمی مضمرات اور متضمنات پر حاوی ہو جائیں تو ہم سمجھ سکیں گے کہ اقبال نے تخلیق اور ارتقائے عالم میں رحمۃ للعلمین کے مقام کے متعلق اوپر کے چار شعروں میں جس خیال کا اظہار کیا ہے اس کی علمی اور عقلی بنیادیں کیا ہیں۔

تقلیبات کا سبب خودی کا زبردست جذبۂ تکمیل ہے

تقلیباتِ حیاتیاتی ہوں یا نظریاتی ان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ خودی یا زندگی کی قوّتِ تخلیق (یعنی خدا کے ارادۂ تخلیق یا قولِ کُن کی قوّت) کائنات کو حالتِ کمال پر پہنچانا چاہتی ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات ہر وقت ایک پیکرِ خوب تر کی جستجو میں رہتی ہے۔ یہ قوّت نہایت ہی زبردست اور

بے پناہ ہے اور اپنے ہر کام پر ہر حالت میں غالب آنے والی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(یوسف: ۲۱)

اور خدا اپنے ہر کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے۔

پھر قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ۝ (فاطر: ۴۴)

اور خدا ایسا نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز اس کو عاجز کر سکے۔ وہ علم والا اور قدرت والا ہے

لہٰذا جب بھی اس قوت کو اپنی منزلِ مقصود کی طرف آگے بڑھنے میں کسی مزاحمت یا رکاوٹ کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنی پوری طاقت جمع کر کے اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے توڑ کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف آگے نکل جاتی ہے۔ زندگی کے اسی وصف کی وجہ سے اقبال نے اسے جوئے کہستان سے تشبیہ دی ہے کہ وہ بھی جب رکتی ہے تو پہاڑوں کی چٹانوں کو چیر کر آگے نکل جاتی ہے

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دِل چیر دیتی ہے یہ

حیوانِ کامل ــــ حیاتیاتی ارتقاء کا مقصود

حیاتیاتی مرحلۂ ارتقاء ایک نہایت ہی چھوٹے سے حیوان امیبا سے شروع ہوا تھا جو مادی طور پر مکمل ہو جانے کی وجہ سے اس قابل ہو گیا تھا کہ زندہ ہو جائے اور زندگی کا جوہر پا لینے کی وجہ سے کشش ثقل اور ایسے ہی دوسرے مادی قوانین کی مزاحمت کا مقابلہ کر سکے جو تمام جامد اور بے حرکت مادی اشیاء کو اپنے ضبط کے شکنجہ میں جکڑے ہوتے ہیں۔ یہ پہلا حیوان اپنی ساخت میں اتنا سادہ تھا کہ صرف ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھا، لیکن زندگی کی رو یا خدا کے قولِ کُن کی قوت جو اس حیوان کے اندر کام کر رہی تھی اس کو برابر ترقی دیتی رہی، یہاں تک کہ اس سے نئی نئی انواعِ حیوانات پیدا ہوتی گئیں، جن کی جسمانی ساخت بتدریج زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی اور جن کے مراکزِ دماغی اور نظام ہائے عصبی متواتر زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ

نئی وجود میں آنے والی انواعِ حیوانات کسی منزلِ مقصود کی طرف آگے بڑھ رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حیاتیاتی مرحلۂ ارتقاء میں خودی کی منزلِ مقصود یہ تھی کہ ایک ایسا کامل جسمِ حیوانی پیدا کیا جائے جو اپنی مکمل جسمانی اور دماغی ساخت کی وجہ سے اس قابل ہو کہ اس میں جوہرِ خودی نمودار ہو جائے تاکہ وہ آئندہ کے ارتقاء کا جو نظریاتی ارتقاء ہونے والا تھا، ذریعہ بن سکے۔ اور پھر اس کی اولاد کو ترقی دے کر روئے زمین پر پھیلا دیا جائے اور تمام حیوانات پر غالب کر دیا جائے تاکہ وہ دوسرے حیوانات کی مزاحمت کے بغیر آزادی سے عملِ ارتقاء کو جاری رکھ سکے۔ یہی حیوانِ کامل انسان ہے۔

حیاتیاتی ارتقاء کی رکاوٹیں

زندگی کو حیاتیاتی مرحلۂ ارتقاء میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف آگے بڑھنے میں جن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، ان میں ایک رکاوٹ حیاتیاتی وراثت کے قانون سے پیدا ہوئی۔ اس قانون کی وجہ سے ایک ہی نوعِ حیوانات کے افراد اپنے آباء و اجداد کی جسمانی ساخت کا اعادہ کرتے ہیں خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، پست ہو یا بلند، اور اس سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ اس قانون سے قدرت کی غرض یہ تھی کہ جب حیوانِ کامل یا انسان وجود میں آئے اور اس کی نسل ترقی پانے لگے تو اس کی اولاد اپنی اس ابتدائی جسمانی ساخت کو جو سب سے پہلے انسان کو عطا ہوئی ہو اور جو کروڑوں برس کے حیاتیاتی ارتقاء کا نہایت ہی قیمتی ثمر قرار پا چکی ہو، نسلاً بعد نسلٍ ایک اندرونی حیاتیاتی دباؤ کی وجہ سے اپنی اصلی صورت میں ہمیشہ قائم رکھ سکے۔ تاکہ انسان اپنی اس پائیدار حیاتیاتی تکمیل اور برتری کی وجہ سے نہ صرف قائم رہے اور دنیا میں پھیل جائے بلکہ اپنے قائم رہنے اور پھیل جانے کی وجہ سے اپنے نظریاتی ارتقاء کو کسی ناقابلِ عبور مزاحمت کے بغیر جاری رکھ سکے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب تک حیاتیاتی سطحِ ارتقاء پر ہر نچلے درجہ کی نوعِ حیوانات میں سے کم از کم ایک فرد حیاتیاتی وراثت کے قانون کو توڑ کر کسی بہتر اور بلند تر قسم کی جسمانی ساخت کا مالک نہ بنے جو اس کی اولاد میں بھی منتقل ہو اُس وقت تک ایک نوع سے دوسری بلند تر نوع پیدا نہ ہو سکتی تھی اور حیوانِ کامل یا انسان کے ظہور تک نوبت ہی نہ پہنچ سکتی تھی۔ (جاری ہے)

لغات و اعراب قرآن (۱۵)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۱۰)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورت کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے، مثلاً ۲:۵:۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم ——— وھکذا۔

۲:۱۰ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

۲:۱۰:۱ اللغۃ

[وَإِذَا] اس میں "وَ" تو بمعنی "اور" ہے۔ "وَ" کے معانی و استعمالات پر الفاتحہ: ۵ میں بات ہو چکی ہے [دیکھئے ۱:۴:۱ (۳)] اور

" اذا " کے یہاں معنی " جب یا جب کبھی یا جس وقت " کے ہیں ۔ " اذا " کے استعمالات اور اقسام (بلحاظ معنی) پر البقرہ : ۱۱ میں بات گزر چکی ہے [دیکھئے ۲: ۹ : ۱ (۱)]

[قِيْلَ] کا مادہ " ق و ل " اور وزن اصلی " فُعِلَ " ہے ۔ اور شکل اصلی " قُوِلَ " تھی ۔ اس مادہ کے فعل مجرد کے معنی و استعمال پر ۔ اور خود اسی فعل ماضی مجہول " قیل " کے معنی وغیرہ پر ابھی اوپر بحث ہو چکی ہے [۲: ۷: ۱ (۵)]

[لَهُمْ] " لام " کا تعلق فعل " قیل " سے ہے ۔ " اِذا " کے معنیٔ شرط کی وجہ سے یہاں قیل کا ترجمہ ماضی کی بجائے حال میں کیا جائے گا ۔ اس طرح " واذا قیل لھم " کا ترجمہ " اور جب کہا جاتا ہے ان سے " ہے اور سلیس ترجمہ " جب ان سے کہا جاتا ہے " ہوگا ۔

[آمِنُوْا] کا مادہ " ا م ن " اور وزن اصلی " اَفْعِلُوْا " ہے ۔ اس کی اصلی شکل " أَأْمِنُوا " تھی ۔ جس میں پہلے دونوں " ھمزے " مل کر " آ " ہو گئے ۔ یہ لفظ (آمِنوا) اس مادہ سے بابِ افعال کا صیغۂ امر (جمع مذکر حاضر) ہے ۔ اس مادہ کے فعل مجرد اور بابِ افعال کے معنی اور استعمالات پر بحث پہلے ہو چکی ہے [دیکھئے ۲: ۲: ۱ (۱)]

۲ : ۱۰ : ۱ (۱) [كَمَا] یہ " کَ " حرف الجرّ (جو بلحاظ معنی حرف تشبیہ بمعنی " مانند " ہے) اور " ما " (اسمیہ بمعنی " جو کہ " ، " جو چیز کہ ") سے مرکب ہے ۔ اس طرح اس (کما) کے لفظی معنی ہوں گے " مانند اس (چیز) کے جو کہ " ۔ پھر اسی کا بامحاورہ اردو ترجمہ " جیساکہ " ، " جیسے کہ " اور " جس طرح کہ " سے کیا جاتا ہے ۔ اور یہ اکٹھا ایک ہی لفظ شمار ہوتا ہے ۔

[آمَنَ] کا مادہ " ا م ن " اور وزن (اصلی) " اَفْعَلَ " ہے ۔ یعنی یہ بابِ افعال سے فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے ۔ اس کے باب اور معنی و استعمال پر بھی بات ہو چکی ہے دیکھئے البقرہ : ۳ یعنی ۲: ۲: ۱ (۱) میں ۔ لفظی ترجمہ ہے " وہ ایمان لایا " اور سیاق عبارت کے مطابق " ایمان لائے "

یا " ایمان لے آئے ہیں " سے ترجمہ ہوگا ۔

[النَّاسُ] کے مادہ واشتقاق وغیرہ پر مفصل بحث البقرہ : ۸ کے تحت ہو چکی ہے [دیکھئے ۲ : ۷ : ۱ (۳) میں] اس کا ترجمہ " لوگ " ہے مگر سیاق عبارت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ " دوسرے لوگ " اور " لوگ " یا " سب لوگ " کیا گیا ہے ۔

[قَالُوْا] کا مادہ " ق و ل " اور وزن اصلی " فَعَلُوْا " ہے ۔ اس کے فعل مجرد کے معنی وغیرہ کے لیے دیکھیے ۲ : ۷ : ۱ (۴) ۔ یہاں شروع میں " اِذَا " آجانے کی وجہ سے اس فعل ماضی (قالوا) کا ترجمہ " کہتے ہیں " بلکہ جواب شرطیہ ہونے کی وجہ سے " تو کہتے ہیں " ہوگا ۔

[أَنُؤْمِنُ] میں ابتدائی " أ " تو استفہامیہ (یعنی کیا ؟) ہے اور " نُؤْمِنُ " کا مادہ " ا م ن " اور وزن " نُفْعِلُ " ہے جو اس مادہ سے باب افعال کا فعل مضارع (صیغہ جمع متکلم) ہے ۔ اس کے مادہ و باب کے معنی وغیرہ کے لئے ۲ : ۲ : ۱ (۱) کی طرف رجوع کیجئے ۔ اس کا لفظی ترجمہ تو " کیا ہم مان لیں / ایمان لائیں " ہوگا جس کو بعض حضرات نے " کیا ہم مسلمان ہو جائیں ؟ " سے ترجمہ کیا ہے جسے مفہوم کے لحاظ سے ہی درست قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اور بعض نے اس سے اگلی عبارت کو ملحوظ رکھ کر بامحاورہ ترجمہ کیا ہے ۔ اس کا ذکر ابھی آئے گا ۔

[كَمَا آمَنَ] پر ابھی اوپر (اسی آیت میں) بات ہو چکی ہے یعنی " جس طرح ایمان لایا "

[السُّفَهَآءُ] کا مادہ " س ف ہ " اور وزن (لام تعریف نکال کر) " فُعَلَاءُ " (غیر منصرف) ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد زیادہ تر " سفِه یسفَه سفاهةً وسَفَهًا " (باب سمع سے) آتا ہے ۔ اور اس کے عام معنی تو ہیں " بے وقوف ہونا ، عقل سے خالی ہونا ، بدھو ہونا ، احمق ہونا " یعنی یہ فعل لازم ہے ۔ تاہم بعض دفعہ یہ فعل

متعدی بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی "بے وقوف بنانا، مت ماردینا، احمق بنادینا" کے معنوں میں آتا ہے۔

● بعض اہلِ علم (اصحابِ لغت) کا کہنا ہے کہ یہ فعل بابِ "سمع" سے تو متعدی معنی کے لیے آتا ہے اور لازم کے معنی میں یہ بابِ "کرُم" سے استعمال ہوتا ہے اور اس لیے اس سے اسم الفاعل (سافِہٌ) کی بجائے صفت مشبہ "سَفِیہٌ" (بوزن "فعیل") آتی ہے۔ جس کے معنی ہیں "احمق یا بیوقوف"۔ اور کتبِ لغۃ کے "بیانات" سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "بابِ سمع" سے آنے والے پانچ چھ افعال ایسے ہیں جو عام طور پر تو بطور "لازم" استعمال ہوتے ہیں تاہم کبھی کبھی یہ فعل متعدی کے طور پر بھی آتے ہیں۔ اس قسم کے افعال میں سے "سفِہ" اور "بطِر" قرآن کریم میں بھی وارد ہوئے ہیں۔ اور بعض (مثلاً "اَلِمَ" یا "رشِد") سے کوئی صیغۂ فعل تو نہیں مگر کچھ اسمائے مشتقہ قرآن کریم میں آئے ہیں۔

● اس مادہ (سفہ) سے ثلاثی مجرد کے صرف ایک صیغۂ ماضی (البقرۃ: ۱۳۰) کے علاوہ کوئی اور فعل قرآن کریم میں نہیں آیا۔ البتہ کچھ مصدر اور مشتقات (سَفَہٌ، سَفَاھَۃٌ، سَفِیہٌ، اور سُفَھَاءُ) استعمال ہوئے ہیں اور زیرِ مطالعہ لفظ "السفھاءُ" صفتِ مشبہ "سَفِیہ" کی جمع مکسر معرف باللام ہے۔ اور یہ جمع غیر منصرف بھی ہے ــــ اس طرح "کَمَا / آمن / السفھاءُ" کا ترجمہ ہوگا "جیسا / جیسے / جس طرح۔ مسلمان ہوئے / ایمان لائے /۔ بیوقوف / احمق" اور اسی کو زیادہ بامحاورہ بنانے کے لیے بعض مترجمین نے اس سے سابقہ کلمات کو بھی ساتھ ملاکر "انؤمن کما آمن السفھاء" کا مجموعی ترجمہ "کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لائیں!" کیا ہے۔ مفہوم درست مگر الفاظ (نص) سے ذرا ہٹ کر ہے۔ کیونکہ اس میں "آمن" کا ترجمہ نہیں آیا۔ اور بعض نے محاورے کے جوش میں اسی حصہ آیت کا ترجمہ "کیا ہم بھی اُلّو بن جائیں جس طرح اُلّو ایمان لائے ہیں" کردیا ہے یہ کسی طرح درست نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس میں تو

"نؤمن" کا ترجمہ "کیا ہم تو بن جائیں" کر دیا گیا ہے ۔ ترجمہ میں الفاظ
اور محاورہ میں توازن رکھنا ہی تو مترجم کے لیے دشوار ہے مگر اسی میں اس کا کمال
ہے ۔

[اَلَا اِنَّهُمْ] کے تینوں اجزاء (اَلَا ۔ اِنَّ اور ھم) پر اور اس
ترکیب کے تراجم پر ابھی اوپر والی آیت البقرہ : ۱۲ [۲ : ۹ : ۱ (۷)] میں بات
ہو چکی ہے ۔

[ھُمُ السُّفَھَآءُ] میں ابتدائی "ھم" (ضمیر فاصل) کا ترجمہ
"وہی ، وہی تو" ہوگا اور "السفھاء" کے معنوں پر ابھی اوپر بحث ہو
چکی ہے [۲ : ۱ : ۱ (۲) میں] اب آپ اس حصۂ آیت (الا انھم ھم السفھاء)
کا گزشتہ آیت (۱۲) کے آخری حصہ (الا انھم ھم المفسدون) کے ترجمہ
سے موازنہ کرتے ہوئے خود ترجمہ کر سکتے ہیں ۔

[وَلٰكِنْ] کے معنی اور استعمال پر بھی ابھی اوپر [۲ : ۹ : ۱ (۸)] میں
بات ہوئی ہے ۔

۲ : ۱۰ : ۱ (۳) [لَا يَعْلَمُوْنَ] کا ابتدائی "لا" تو فعل میں منفی کے
معنی پیدا کرنے کے لیے ہے ۔ اور "یَعْلَمُوْنَ" کا مادہ "ع ل م" اور
وزن "یَفْعَلُوْنَ" ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "عَلِم ..... یعلَم عِلمًا"
(باب سمع سے) بکثرت استعمال ہوتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو "..... کو
جاننا یا جان لینا" ہیں ۔ تاہم یہ کبھی "کسی چیز کی حقیقت جان لینا" اور اس کے
بارے میں یقین حاصل کر لینا" (یعنی تَیَقَّنَ) کے معنوں میں آتا ہے ۔ اس وقت
اس کے دو مفعول مذکور ہوتے ہیں ۔ جیسے "عَلِمْتُمُوْھُنَّ مؤمناتٍ"
(الممتحنہ : ۱۰) میں آیا ہے ۔

● اور اگر صرف "جاننا ، پہچان لینا" (عَرَفَ) کے معنوں میں ہو تو صرف
ایک مفعول کے ساتھ آتا ہے جیسے "یعلمُ خائنۃَ الاعینِ" (المؤمن: ۱۹)

ہیں ہے اور یہ استعمال قرآن کریم میں بکثرت ہے (دو سو سے بھی زائد مقامات پر)۔ اور ان معنوں کے لیے اس کا مفعول بنفسہٖ (صلہ کے بغیر) بھی آتا ہے جو کوئی اسم بھی ہو سکتا ہے اور "اَنْ" سے شروع ہونے والا کوئی جملہ بھی ـــــ اور بعض دفعہ اس فعل پر باء (بِ) کا صلہ بھی آتا ہے جیسے "یعلَمُون بِما غفَرلی ربی : ۲۶) میں ہے۔ یعنی یہ فعل "عِلمہٗ اور علِم بہ" دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور اس (صلہ والے فعل) سے ہی صفت مشبہ "علیم" اور افعل التفضیل "اعلمُ" اکثر اسی صلہ (بِ) کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔

● اور کبھی یہ فعل (علِم) فعل لازم کی طرح "عالم ہونا، صاحب علم ہو جانا" کے معنوں میں بھی آتا ہے اس وقت اس کے ساتھ مفعول مذکور نہیں ہوتا جیسے "والذین لا یعلمون" (الزمر : ۹) اور "جو جاہل ہیں" کے معنوں میں آیا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل کا یہ استعمال (بحذفِ مفعول) بھی بکثرت آیا ہے۔ اور جب یہ فعل اللہ تعالیٰ کے بارے میں آئے تو اس کے معنی "ظاہر کر دینا"، "واضح کر دینا" یا "فرق کر دینا" کے ہوتے ہیں۔ جیسے کہ "واللّٰہ یعلم المفسد مِنَ المصلح" (البقرہ : ۲۲۰) میں اور بہت سے دوسرے مقامات پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

۲ : ۱۰ : ۲ الإعراب

واذا قیل لھم آمنوا کما آمن الناس قالوا انؤمن کما آمن السفھاء ۔ الا انھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون ۔

آیت کا ابتدائی حصہ (واذا ..... سے السفھاء تک) دراصل دو جملوں پر مشتمل ہے جو شرط اور جواب شرط کے طور پر ایک بڑا جملہ بناتے ہیں۔ آخری حصہ (الا انھم ..... سے لا یعلمون تک) بھی دراصل دو جملے ہیں جن کو واو عاطفہ

سے ملا دیا گیا ہے۔ اعراب کی تفصیل یوں ہے:

● [وَاِذَا] میں "وَ" استیناف (الگ جملے کی ابتداء) کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور عطف کے لیے بھی اور "اِذا" (گزشتہ آیت ۱۱ کی طرح) یہاں بھی ظرفیہ شرطیہ ہے [دیکھیے ۲:۹:۱(۱)] اس لیے اگلے فعل ماضی کا ترجمہ "فعل حال" سے ہوگا۔ [قِیل] فعل ماضی مجہول۔ صیغہ واحد مذکر غائب۔ ہے اور اس کا نائب فاعل لفظ "قَوْل" محذوف ہے یعنی دراصل "قیل قولٌ ھو آمنوا" ہے۔ [لَھُم] جار (لِ) اور ضمیر مجرور (ھم) مل کر متعلق فعل "قیل" ہیں۔ یعنی یہ "لام" اس آدمی (مفعول) کو متعین کرتا ہے جس سے بات کی گئی۔ [آمِنوا] فعل امر حاضر کا صیغہ جمع مذکر ہے۔ اور دراصل تو اسی "آمنوا" کو ہی فعل مجہول "قیل" کا نائب فاعل سمجھنا چاہیئے مگر بعض نحوی حضرات کہتے ہیں کہ جملہ قائم مقام فاعل (نائب فاعل) نہیں بن سکتا اور اسی لیے وہ اس (آمنوا) سے پہلے لفظ "قولٌ" محذوف ماننے پر مجبور ہوئے ہیں۔ بعض جدید نحوی (مثلاً ڈاکٹر شوقی ضعیف کہتے ہیں کہ جملہ فاعل یا نائب فاعل بن سکتا ہے[1]۔ [کَما] یہ حرف جار (کَ) اور "ما" (جو موصولہ بمعنی مصدریہ ہے) کا مرکب ہے اور اس کی وجہ سے نحوی حضرات [آمن الناسُ] کو جو دراصل فعل (آمن) اور فاعل (الناس) کا مرکب جملہ ہے ــــ اس میں فعل کو مصدر مضاف اور "الناس" کو مضاف الیہ کی طرح سمجھتے ہیں۔ اور "کما" کو ایک مصدر محذوف کی صفت سمجھتے ہیں گویا کہ اس حصۂ آیت (آمنوا کما آمن الناس) کی "تقدیر" (یعنی مفہوم عبارت) کچھ یوں بنتی ہے "آمنوا ایماناً کایمان الناسِ" یا "آمنوا ایمانا مثلَ ایمانِ الناس" یا "آمنوا ایمانا مثل ما آمن الناس" ــــ یعنی "لوگوں کے ایمان جیسا ایمان لاؤ" ــــ تاہم اردو میں "کما" کا ترجمہ "جیسا کہ" جس طرح کہ" کر لینے سے اس کے مصدری معنی لینے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ

---

[1] تجدید النحو ص ۱۶۰ اور ص ۲۵۹

فعل ماضی کے ساتھ ہی ترجمہ ہو سکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین نے اس جملہ " کَمَا آمن النا س " کے ترجمہ میں " کما " (جس طرح کہ، جیسا کہ) کے بعد " آمن النا س " کا ترجمہ فعل اور فاعل کے ساتھ ہی کیا ہے (لوگ ایمان لائے ہیں) ۔ یہ ترجمہ عربی الفاظ سے بھی قریب تر بنتا ہے اور محاورہ کے بھی مطابق ہے ۔ اس لیے نحوی حضرات کے تکلّف کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی ۔

— یہاں تک جملہ کا شرط والا حصّہ پورا ہو جاتا ہے اس کے بعد

● [قالوا] سے شرط کی جزاء یا جواب شرط کی ابتداء ہوتی ہے ۔ اور شرط اور جواب شرط کے ماضی کے صیغہ ہونے کی وجہ سے کوئی جازم اور مجزوم نہیں ہے ۔ اگرچہ وہ محلاً مجزوم سمجھے جا سکتے ہیں ۔ [أنومن] میں " أ " استفہامیہ ہے اور یہاں استفہام انکار کے معنوں میں ہے ۔ اور " نؤمن " فعل مضارع ہے جس میں ضمیر فاعلین " نحن " مستتر ہے [کما] پر ابھی بات ہوئی ہے ۔ یہاں بھی اس کی اعرابی پوزیشن سابقہ " کما " کی سی ہے [آمن السفہاء] فعل اور فاعل (مرفوع) پر مشتمل ہے اور یہاں بھی " أنومن کما آمن السفہاء " کو بعض نحوی حضرات کے بقول تقدیراً " انومن ایماناً مثل ایمان السفہاء " سمجھا جا سکتا ہے ۔ مگر اردو محاورے کے لئے اس تکلّف کی ضرورت نہیں ہے بلکہ سیدھا لفظی ترجمہ ہی اردو محاورے کے عین مطابق ہی بنتا ہے ۔ یعنی " کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ بے وقوف (لوگ) ایمان لائے ہیں "۔ اور چونکہ یہاں استفہام میں دراصل مفہوم انکار کا ہے ، اس لیے عبارت کا اصل مفہوم بنتا ہے کہ " ہم اس طرح کا ایمان تو نہیں لائیں گے "۔

● [أَلَا] حرفِ آغاز (استفتاح) بمعنیٔ تنبیہ ہے ۔ اس لفظ کے مختلف تراجم پر ابھی اوپر بحث " اللغۃ " میں بات ہو چکی ہے ۔ اور [اِنَّھُمْ] میں " اِنَّ " حرف مشبہ بالفعل اور " ھم " ضمیر منصوب اس (اِنَّ) کا اسم ہے ۔ [ھم السفہاء] میں " ھم " ضمیر فاصل ہے جس کا اردو ترجمہ " ہی "

یا " ہی تو " سے کیا جاتا ہے۔ اور " السفھاءُ " " اِنَّ " کی خبر (لہٰذا) مرفوع ہے۔ علامتِ رفع آخری ھمزہ کا ضمہ (ـُـ) ہے۔ اس طرح " الا انھم ھم السفھاء " کا ترجمہ ہوگا " سن لو! یقیناً وہ خود ہی بے وقوف ہیں "

● [وَلٰکِنْ] میں " وَ " عاطفہ اور " لٰکن " حرف استدراک ہے جس کے معنی وغیرہ پر ابھی اوپر (" اللغۃ " کے تحت) بات ہوئی ہے۔ [لایعلمون] فعل مضارع منفی مع ضمیر فاعلین " ھم " (مستتر) ہے۔ اور یہ پورا جملہ اپنے سے سابقہ جملے (الا انھم ھم السفھاء) پر عطف ہے تاہم اردو میں " ولکن " کا ترجمہ " لیکن " سے کیا جاتا ہے اردو محاورے میں یہاں واوِ عاطفہ کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۲:۱۰:۳ الرسم

واذا قیل لھم امنوا کما امن الناس قالوا انومن کما امن السفھاء۔ الا انھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون۔

اس آیت کے تمام کلمات کا رسم قرآنی اور رسم املائی یکساں ہے حتیٰ کہ کلمہ " ولکن " کا بحذف الف (بعد لام) لکھا جانا بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اس کے متعلق آیت ۲:۱۲ میں مفصل بات ہوئی تھی۔

۲:۱۰:۴ الضبط

آیت کے کلمات کے متفقہ یا مختلف فیہ ضبط کو حسب ذیل مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

وَاِذَا ، اِذٰا ، اِذَا / قِیْلَ ، قِیلَ ، قِیلَ ، قِیلَ

لَھُمْ / اٰمِنُوْا ، اٰمِنُوا ، ءَامِنُوْا ، اٰمِنُوْا

كَمَا ، كَمَا / اٰمَنَ ، ءَامَنَ ، آمَنَ

النَّاسُ ، النَّاسُ ، اَلنَّاسُ ، اَلنَّاسُ

قَالُوْا ، قَالُوا ، قَالُوْا ، قَالُوْا

اَنُؤْمِنُ ، اَنُؤْمِنُ ، آنُؤْمِنُ / كَمَا (مثل سابق)

اٰمَنَ (مثل سابق) السُّفَهَآءُ ، السُّفَهَاءُ ، اَلسُّفَهَاءُ

اَلسُّفَهَآءُ / اَلَا ، اَلَا ، اَلَا ، آلَا / اِنَّهُمْ ، اِنَّهُمْ /

هُمُ / السُّفَهَآءُ (مثل سابق) / وَلٰكِنْ ، وَلٰكِنْ

وَلٰكِنْ / لَا يَعْلَمُوْنَ ، لَا يَعْلَمُوْنَ ، لَا يَعْلَمُوْنَ

بقیہ تبصرہ کتب

کتب جن کی اکثریت ہنوز مخطوطات کی شکل میں ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں ـــ سے استفادہ کرکے فنِ تالیف و تصنیف کے تمام جدید ضوابط کا لحاظ کر کے ایک ایسی کتاب کا مرتب کرنا تھا جو اس راہ کے راہیوں کے لیے مشعلِ راہ اور رہنمائی کا باعث ہو۔ الحمد للہ کہ ایک ایسی چیز مارکیٹ میں آگئی ـــ طلبائے قرآن کے لیے ایک اچھوتی کتاب جس سے وہ ہی نہیں، اساتذہ بھی بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں، بلکہ انہیں ضرورت ہے کہ وہ ایسا کریں تاکہ غلطیوں سے بچا جا سکے ـــ ساتھ ہی ہر مسلمان کے لیے یہ تحفہ ہے کہ ہر مسلمان قرآن سے وابستگی رکھتا ہے، اس کی تلاوت کرتا ہے اس پر بھی صحت سے تلاوت لازم ہے۔ زبان سلیس اور شگفتہ، تاکہ ایک عام مسلمان بھی استفادہ کر سکے ـــ ہمیں یقین ہے کہ خادمانِ قرآن اس ناگزیر کتاب کو فوراً حاصل کریں گے تاکہ انہیں جدید ایڈیشن کی زحمتِ انتظار سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

(ابوالسیف محمدی)

سیرتِ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے بعض تابناک گوشے

نصرت علی اثیر

انفاق فی سبیل اللہ

حضرت عبداللہ بن مبارک نے جب ماں کی گود میں آنکھ کھولی تو گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ تربیت اور پرورش شہزادوں کی طرح ہوئی۔ جوں جوں ہوش سنبھالا اور جوانی میں قدم رکھا اس دولت کی کثرت اور گھر کے لاڈ پیار کے ہاتھوں کچھ زیادہ ہی آزاد ہو گئے۔ نتیجۃً دولت کا اصراف غلط جگہ ہونے لگا۔ دولت کو شراب، سوز و ساز اور یاروں کی محافل میں پانی کی طرح بہایا۔ لیکن آخر جب اللہ تعالیٰ نے راہ دکھائی اور برائی کی حقیقت سے آشنا ہوئے تو یہی صرفِ دولت جذبہ نیکی کے کاموں میں ظاہر ہوا۔ پڑھنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور دینی ذوق کو جلا ملتی گئی۔ والدین بھی بیٹے کے سنبھالنے سے خوش ہوئے۔ فوراً والد نے پچاس ہزار درہم دیئے اور کہا بیٹا جاؤ اور تجارت کر کے نفع کماؤ۔ گئے اور مختلف دور دراز علاقوں میں گھوم پھر کر صحابۂ عظام اور تابعین کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی علم کے خزانوں کو خرید کر گھر لائے۔ ابو نے نفع پوچھا تو کہا کہ ابا جان دو جہان کا نفع کما کے لایا ہوں اور حدیث کی کتابوں کے ڈھیر کو ابا جان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ نیا نیا سنبھالا تھا۔ والد نے خوش ہو کر چار ہزار اور درہم دیئے کہ جاؤ اور اپنے منافع کو اور پورا کرو۔ یہ ابتدائے کار تھی۔ تجارت کو پیشہ بنایا اور خوب دلچسپی لے کر ضروریاتِ دنیا کی کفالت کے لئے اسے نبھایا۔ آپ اپنی تجارت کے مقاصد کی سمت متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

علی بن الفضل فرماتے ہیں:

"میں نے اپنے والد سے سنا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک سے کہا کہ آپ ہمیں تو زہد، تقلل اور قناعت کا حکم دیتے ہیں جبکہ آپکا سرمایہ خراسان سے بلدالحرام تک تجارت میں لگا نظر آتا ہے۔ یہ کیسا تضاد ہے؟ حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے فرمایا اے ابوعلی! یہ میں اس لئے کرتا ہوں تاکہ اپنے چہرے کو سوال کے داغ سے محفوظ کر سکوں۔ اور اپنی عزت کو بچا سکوں۔ اور اس سے میں طاعتِ ربّی پر استعانت لیتا ہوں۔ جب بھی اللہ کے حق کو دیکھتا ہوں اس کے لئے سرعت سے کام لیتا ہوں یہاں تک کہ اسکو پورا کرتا ہوں۔ حضرت فضیل نے پھر کہا کہ اے ابن المبارک اگر ایسے ہو تو پھر یہ کس قدر بہتر ہے۔ اور اگر ایسے ہی اس کا انجام ہو"۔[1]

حبان بن موسیٰ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"لوگ حضرت عبداللہ بن مبارک پر بڑے ناراض ہوتے کہ وہ اپنا مال مختلف شہروں میں بانٹ دیتے ہیں جبکہ اپنے شہر میں سارا نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس گروہ کے گھروں کو جانتا ہوں جن کو فضیلت اور صداقت حاصل ہے وہ حدیث کا علم حاصل کرتے ہیں۔ لوگوں نے محتاج لوگوں کی حاجتوں سے علم حدیث کی طلب کو احسن قرار دیا۔ تو آپ نے کہا کہ اگر ہم انہیں چھوڑ دیں تو ان لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دیں گے۔ اور اگر ہم ان کی معاونت کریں تو اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کیلئے علم پھیلے گا۔ اور میں نہیں جانتا کہ نبوّت کے بعد علم کی اشاعت سے بڑھکر کوئی افضل کام ہو"۔[2]

آپ نے فضیل بن عیاض سے ایک دفعہ کہا:-

"لولاك واصحابك ما اتجرتُ"

اگر آپ اور آپ کے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا۔

کردری اس سے آگے لکھتے ہیں:

"وکان ینفق علی الفقراء فی کل سنۃ مائۃ الف"

آپ ہر سال فقراء پر ایک لاکھ کی مالیت خرچ کرتے۔

آپ لوگوں کی عزتِ نفس کا بڑا خیال کرتے تھے۔ عمرو بن حفص سوفی سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک مصیصہ کی طرف جہاد کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ صوفیاء تھے۔ آپ نے ان سے کہا۔ تمہارا نفس تمہیں خرچ کرنے سے ڈراتا رہتا ہے۔ غلام سے کہا کہ رومال لاؤ، اور اسے بچھوا دیا۔ اس کے اوپر ایک اور رومال بچھوا دیا۔ پھر ان سے کہا آپ سب کے پاس جو کچھ ہے اس رومال کے نیچے والے رومال پر ڈالتے جاؤ۔ ہر آدمی نے جو دس بیس درہم تھے اس میں ڈال دیئے۔ آپ نے مصیصہ کے پورے سفر میں ان پر خرچ کیا۔ وہاں پہنچ کر ان سے کہا یہ علاقہ دوسرا ہے اب بقیہ روپیہ کو باہم تقسیم کر لیں۔ جس میں ہر ایک کو آپ نے بیس بیس دینار دیئے۔ کسی نے کہا اے ابوعبدالرحمن میں نے تو بیس درہم دیئے تھے تو آپ نے کہا کیا تجھے اس بات سے انکار ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے غازی کے نفقہ میں برکت ڈال دی ہو۔[۳]

آپ ایک سال حج کرتے تھے اور ایک سال جہاد۔ چنانچہ جب کبھی بھی حج پر جاتے تو لوگ آپ کی مصاحبت میں جانے پر مصر ہوتے۔ چنانچہ آپ ان سے ان کے تمام نفقات منگوا لیتے۔ اور انہیں ایک صندوق میں رکھ کر تالہ لگا دیتے۔ جس کے بعد مرو سے بغداد کو روانہ ہو جاتے، راستہ میں ان پر خرچ کرتے، انہیں بہترین کھانا کھلاتے، اور پھر بغداد سے نکلتے تو مدینۃ الرسول تک جاتے جاتے انہیں شاندار اور میٹھے کھانے کھلاتے۔ مدینہ پہنچ کر ہر ایک سے کہتے کہ جو کچھ ان کے گھر والوں نے خریدنے کے لئے کہا ہے، خرید لیں۔ چنانچہ ہر ایک کی چیزیں خرید دیتے۔ پھر اسی طرح مکہ چلتے۔ مکہ پہنچ کر ان کی جملہ حوائج پوری کرتے اور انہیں ان کے اہل وعیال کی فرمائشوں کے مطابق سامان خرید دیتے۔ پھر مکہ سے واپس اسی شان اور جلالت سے واپس مرو پہنچ جاتے۔ تین دن کے بعد آپ ان کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کرتے، ہر ایک کو نیا لباس پہناتے، اور جب سب کھانے سے فارغ ہو جاتے تو صندوق منگوا کر کھولتے۔ اور ہر ایک کو اس کے نفقہ کی تھیلی جس پر اس کا نام لکھا ہوا ہوتا واپس کر دیتے۔[۴]

مسیّب بن واضح روایت کرتے ہیں کہ میں آپ کے پاس موجود تھا جب آپ

سے لوگوں نے ایک آدمی کے سات ہزار درہم کے قرض کو چکانے کے لئے کہا۔ چنانچہ آپ نے اپنے خزانچی کو لکھا کہ وہ فلاں بن فلاں کو سات ہزار درہم دے۔ جب کاغذ خزانچی کے پاس آیا اور اس نے دیکھا کہ لکھائی کی غلطی سے چودہ ہزار درہم لکھ دیئے گئے ہیں۔ تو کاغذ کو آپ کی طرف واپس بھیجا گیا تاکہ صحیح کر دیں اور اس نے لکھا کہ اگر اس طرح آپ لکھتے رہے تو آپ کی جملہ رقم ضائع ہو جائیگی۔ آپ نے جواب میں لکھا اگر تو میرا خزانچی ہے تو جو کچھ تجھے کہا گیا ہے اسے کر گزر نہیں تو آ اور میری جگہ پر بیٹھ اور میں تیری جگہ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور جو کچھ تو لکھے گا میں اس کو نافذ کروں گا۔ اس کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہوئے لکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کسی نے مسلمان بھائی کو اچانک خوش کر دیا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کر دے گا" پس میں چاہتا ہوں کہ اسے اچانک فرحت پہ فرحت دوں۔[۵]

ایک دفعہ آپ سے کسی سائل نے سوال کیا تو آپ نے اسے ایک درہم دیا۔ آپ کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ لوگ تو بھنا ہوا گوشت اور حلوہ کھاتے ہیں۔ اس کو تو ایک ٹکڑا بھی کافی تھا۔ تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں نے یہ گمان نہیں کیا کہ یہ سبزی اور روٹی کھاتا ہوگا۔ اگر یہ حلوہ اور گوشت کھاتا ہے تو یہ ایک درہم تو اسے کافی نہیں ہوگا۔ چنانچہ آپ نے کسی لڑکے کو کہا کہ اسے لوٹا لائے اور اسے دس درہم دیئے۔[۶]

محمد بن موسیٰ فرماتے ہیں کہ آپ اکثر طرسوس جاتے تو رقہ میں ایک دکان پر ٹھہرتے۔ وہاں ایک لڑکا ہوتا جو آپ کے پاس آتا جاتا۔ آپ کی ضروریات پوری کرتا اور آپ اس سے حدیث سنتے۔ ایک دفعہ جب آپ رقہ آئے۔ تو اس جوان کو نہ دیکھا۔ آپ کو جلدی تھی۔ اور آپ لڑائی کے گروہ میں تھے۔ جب آپ غزوہ سے لوٹے اور رقہ آئے تو اس جوان کے بارے پوچھا۔ لوگوں نے بتلایا کہ وہ قرض کی وجہ سے آجکل قید میں ہے۔ آپ نے پوچھا کہ قرض کتنی مالیت میں ہے۔ لوگوں نے کہا دس ہزار درہم آپ اس وقت تک پھر نہ سوتے جب تک کہ اس صاحب مال کا پتہ چلا کر رات ہی میں نہ بلا لیا اور اسے دس ہزار درہم گن کر دیئے اور اس سے حلف لیا کہ وہ میری موت تک کسی کو اسکے بارے نہیں بتائے گا۔ فرماتے ہیں جب صبح ہوئی

اور اس جوان کو رہائی مل گئی - اور اسے پتہ چلا کہ عبداللہ بن مبارک یہاں آئے تھے اور انہوں نے اسے پوچھا تھا - چنانچہ وہ آپ کے پیچھے چل پڑا، یہاں تک کہ رقہ سے دو تین منزلوں کے بعد آپ سے جا ملا - آپ نے کہا کہ آپ کہاں تھے دکان پر نہیں تھے کہنے لگا ہاں ابو عبدالرحمٰن میں قرض کی وجہ سے قید تھا - آپ نے پوچھا پھر رہائی کیسے ہوئی؟ تو کہنے لگے کوئی آدمی تھا جس نے قرض دے کر مجھے رہا کرا دیا اور میں آج نہیں جانتا - آپ نے کہا اے جوان اللہ کی حمد و ثنا کر جس نے تیرے قرض کی ادائیگی کی کسی کو توفیق بخشی ہے۔

ایک دفعہ ابو اسامہ آپ کے ہاں آئے - پریشان حال ان کے چہرے سے ٹپک رہی تھی - لیکن انہوں نے اپنی پریشان حال کا کوئی ذکر نہ کیا اور واپس چلے گئے - آپ نے اس کی پریشانی نظروں سے اس کے درد کا احساس کر لیا اور فوراً چار ہزار درہم کپڑوں کی ایک گٹھڑی اور ایک رقعہ بھیجا - اس رقعہ میں یہ شعر لکھے -

وفتی خلا من مالہ ومن المروۃ غیر خال
اعطاک قبل سوالہ وکفاک مکروہ السوال[۸]

ایک دفعہ حج کو چلے - کئی شہروں سے گزرے - آپ کا پرندہ مر گیا تو آپ نے اسے راستے میں مٹی کے ڈھیر پر چھوڑ دیا - آپ کے ساتھی چلتے گئے جبکہ آپ پیچھے رہ گئے - جب آپ کا گزر اس مٹی کے ڈھیر سے ہوا - تو دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکی قریب کے گھر سے نکلی اور اس نے اس مردہ پرندے کو اٹھایا اور اسے لپیٹتے ہوئے تیزی سے گھر کی طرف چل دی - آپ وہاں آتے اور اس لڑکی سے پوچھنے لگے کہ اس کا کیا معاملہ ہے - کہ اس نے ایک مردہ پرندے کو اس حال میں تیزی سے اٹھایا - تو وہ کہنے لگی - میں اور میرا بھائی یہاں رہتے ہیں - ہمارے گھر میں اس چادر کے سوا کوئی چیز نہیں، ہمارے پاس اس ڈھیر پر سے ملنے والی اشیاء کے سوا کوئی کھانے کی چیز نہیں - اور چند دنوں سے ہمارے لئے یہ مردار حلال ہو گئے ہیں - ہمارے والد کے پاس کثیر تعداد میں مال تھا - ان پر ظلم کیا گیا، اور ان سے ان کا مال چھین لیا گیا - اس کے بعد انہیں قتل کر دیا گیا - حضرت عبداللہ بن مبارک نے ساتھیوں کو واپس مڑنے کا حکم دیا ——— اور اپنے وکیل سے پوچھا کہ آپ کے پاس کسقدر نفقہ باقی ہے - اس نے کہا ایک ہزار دینار۔

آپ نے اسے کہا کہ ان میں سے بیس دینار گن لو جو کہ ہمیں مرو واپس جانے کے لئے کافی ہو گئے، اور باقی اس لڑکی کو دے دو۔ یہ اس سال ہمارے حج سے افضل ہے۔ اور واپس لوٹ گئے۔[۹]

اسمٰعیل بن عیاش فرماتے ہیں :

"حضرت عبداللہ بن مبارک کی مثال کوئی فرد کرہ ارض پر نہ تھا۔ اور نہ ہی آپ کی طرح کا کوئی زیادہ جاننے والا۔ اللہ تعالےٰ نے نیکی کی خصلتوں میں سے جو بھی خصلت بنائی وہ آپ میں موجود تھی اور مجھے میرے ساتھیوں نے بتایا کہ انہوں نے آپ کے ساتھ مصر سے لیکر مکہ تک کا سفر کیا۔ آپ انہیں کھجور ملائی اور میدہ سے تیار کی ہوئی مٹھائی کھلاتے جبکہ خود صائم الدھر ہوتے"۔[۱۰]

تقویٰ و پرہیزگاری

آپ حد درجہ متقی، پاکباز، پارسا اور پرہیزگار تھے۔ ہر معاملہ میں خوف آخرت اور خوف خدا اُن کے پیش نظر رہتا۔ دُنیا کی مشقتوں اور مصیبتوں کو آخرت کے عذاب سے کئی گنا آسان سمجھتے تھے۔ ایک روز آپ نے ایک دکاندار سے انگور خریدنے چاہے انگوروں میں سے ایک دانہ اٹھا کر نمونے کے طور پر کھا لیا۔ انگور خرید کر جب گھر آئے تو دل میں خیال گزرا کہ میں نے دکاندار کی اجازت کے بغیر ایک دانہ کھا لیا تھا۔ واپس ہوئے اور دکاندار سے دانہ بخشوانا چاہا اس نے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا دس درہم لے کر بخش دے اس نے پھر انکار کیا یہاں تک کہ نو سو درہم وصول کرنے پر اس نے بخشا۔ اس پر دکاندار نے ہنس کر کہا کہ میں نے کیسے فریب سے اس قدر آپ سے روپیہ لیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کچھ بڑی بات نہ تھی اگر پھر بھی انکار کرتا تو میں پانچ ہزار روپیہ تک دینے کو راضی تھا۔[۱۱]

حسن بن شفیق آپ کا قول نقل کرتے ہیں :

"متشابہ ایک درہم لوٹانے سے میں یہ بہتر جانتا ہوں کہ ایک لاکھ سے سات لاکھ درہم تک صدقہ کر دوں"

اسی طرح آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس کسی میں سو خصلتیں تو پرہیزگاری کی ہوں۔ جبکہ صرف ایک میں بد احتیاطی کرتا ہو تو وہ آدمی متقی نہیں ہو سکتا۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالےٰ ہی ہے جو اپنی طاعت سے کسی کو بلند مرتبہ پر لے جائے اور وہی خدا ہی ہے جو کسی کو ہلاکت میں ڈال دے۔[۱۲]

موسیٰ بن حماد سے روایت ہے کہ جب آپ ہمیں کتاب الزہد پڑھا رہے ہوتے تھے۔ تو آپ کی حالت اس بیل کی سی ہوتی تھی جس کو ذبح کیا جا رہا ہو۔[۱۳]

ایک دفعہ آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کا گھوڑا ایک دوسرے آدمی کی زراعت میں چلا گیا۔ آپ نے اس گھوڑے کو وہیں چھوڑ دیا اور آئندہ اس پر سوار نہ ہوئے۔[۱۴]

قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن مبارک کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا کہ ایک بات رہ رہ کے یاد آتی۔ اور میں دل ہی دل میں سوچتا کہ کس چیز نے اس آدمی کو ہم سے زیادہ فضیلت والا بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں میں اسے اس قدر شہرت حاصل ہو گئی ہے۔ اگر وہ نماز پڑھتا ہے تو ہم بھی نماز پڑھتے ہیں، اگر وہ روزے رکھتا ہے تو ہم بھی روزے رکھتے ہیں، اگر وہ لڑائی میں حصّہ لیتا ہے تو ہم بھی لڑائی میں حصّہ لیتے ہیں اور اگر وہ حج کرتا ہے تو ہم بھی حج کرتے ہیں آخر ایک دفعہ جب ہم شام کی مسافت پر تھے اور ایک جگہ راستے میں رات پڑ گئی۔ پڑاؤ میں جب بتیاں گل کر دی گئیں۔ تو ہمارا ایک ساتھی کمرے سے چراغ اٹھا کر باہر نکل گیا، اور جا کر چراغ جلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب کمرہ میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہے اس وقت مجھے خیال ہوا کہ یہ خشیت ہی اس کی فضیلت کا سبب ہے شاید جب چراغ گل ہوا اور تاریکی ہو گئی تو انہیں قیامت کی ظلمت یاد آ گئی۔[۱۵]

حسن بن ربیع فرماتے ہیں:

دورانِ سفر غریب الوطنی کی حالت میں جب آپ کی حالت قریب الموت تھی۔ آپ کا ستو کھانے کو جی چاہا۔ لیکن اس وقت اور تو کہیں سے نہ ملے صرف قافلے کے

حوالے اس کام میں جُت گئے، اور یہ معرکۃ الآراء کتاب بہت ہی خوبصورت لباس میں سامنے آگئی —

قرآن مجید ــــ ربِ کائنات کی آخری کتاب ہے جسے رہتی دنیا تک باقی رہنا ہے، سابقہ کتب سماوی کی طرح ہر قسم کے حک و اضافہ، تغیر و تبدّل اور تحریف سے پاک یہ کتاب انسانیت کے لیے مشعلِ ہدایت ہے اور تمام علوم و فنون کا منبع۔ اس کے حقیقی محافظ ربّ العزّت خود ہیں تو عالمِ اسباب میں اس کی حفاظت کے ایسے ایسے اطوار نظر آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ــــ حجاج بن یوسف جیسے خاص انتظامی امور کے ماہر انسان جس پر تاریخ کے حوالے بڑے بڑے الزام ہیں اس کلامِ الٰہی کی ایسی خدمت کر گئے کہ عالمِ اسلام کی گردنیں جذبۂ عقیدت سے خم ہیں۔

اس کلامِ مقدس کی حفاظت کے یہ مختلف پہلو ہیں کہ اس کے الفاظ، رسم الخط، آدابِ تلاوت — الغرض ہر ایک کا ایک ضابطہ ہے اور اس ضابطہ سے انحراف سراسر غلط، گمراہی اور بدبختی کا سبب!

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور آخری رسول ــــ جس پر یہ نازل ہوا، اسے اس کی تلاوت اس طرح کرنے کا حکم دیا جیسے اس کا حق ہے، لیکن آج دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ اس طرح اس کی تلاوت کرتے ہیں کہ اس سے ایمان معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے۔ نہ مخارج کا خیال ہے نہ صفاتِ لازمہ کا ـــ وقف کی پہچان ہے نہ ابتدا کا تعارف۔ حال یہ ہے کہ وقف و ابتدا کے حوالہ سے ایک مستقل ضابطہ ہے جس کی پابندی لازم ہے — قرآن کی ہر سطر میں آپ کو مختلف قسم کی علامات نظر آئیں گی جو وقف کے حوالہ سے کام آتی ہیں۔ ان میں سے بعض پر ٹھہرنا لازم ہے تو بعض پر غیر لازم، اور حسنِ تلاوت کے لیے ہی نہیں، سلامتی ایمان کے لیے بھی ان ضوابط کا اہتمام ضروری ہے، لیکن کرتا کون ہے؟

ایک زمانہ میں بالخصوص متحدہ ہندوستان میں بعض حضرات نے شدت سے یہ فتنہ اٹھایا کہ آیاتِ الٰہی کے درمیان گول دائرہ کے نشان کے سوا باقی سب علامات بدعت ہیں، ہر چیز کو بدعت کہنے کا خبط بھی انسان کو کہاں لے جاتا ہے، اس وقت کے صاحبِ نظر علماء نے اس فتنہ کے سامنے بند باندھا اور حقیقتِ حال کی وضاحت کی، اس صورتحال کی بھی کتاب کے آخر میں وضاحت ہے اور دورِ قدیم و جدید کے بعض نامور علمی اداروں اور افراد کی تصریحات شامل کر لی گئی ہیں ــــ لیکن اصل کارنامہ عربی زبان کی ۸۰ سے زائد

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

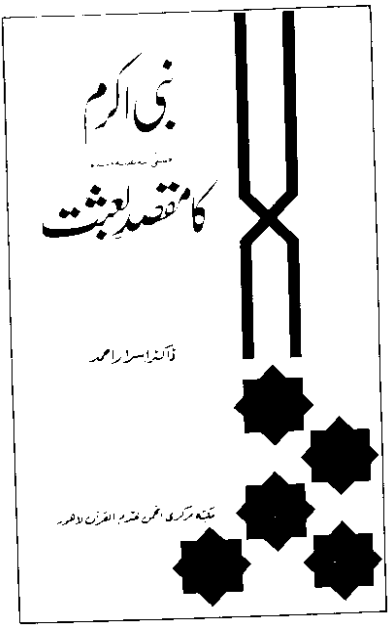

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۶ روپے

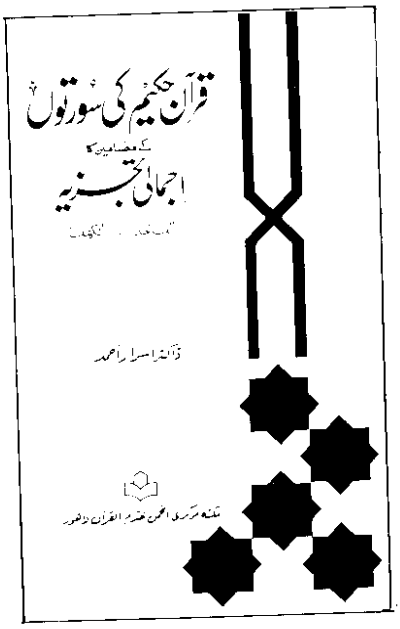

اشاعتِ خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

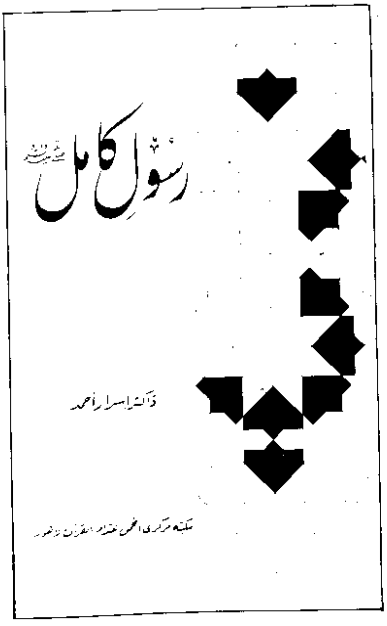

اشاعتِ خاص -/۱۲ روپے، عام -/۵ روپے

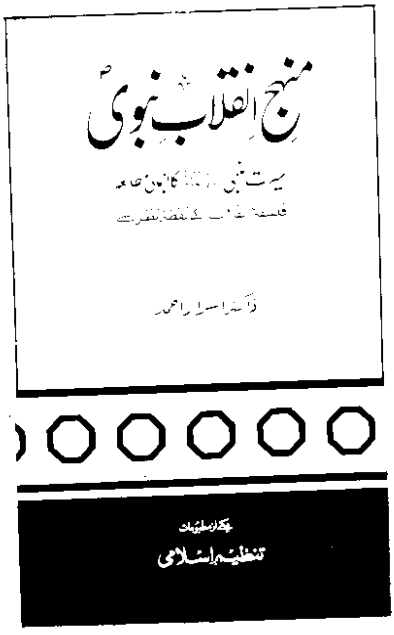

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

AUGUST 1990 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 9
NO. 7

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ